معارف

مارچ ۲۰۱۷ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰؍روپئے۔ فی شمارہ ۲۵؍روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴؍روپئے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰؍روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰؍روپئے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰؍روپئے میں دستیاب۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

HAFIZ SAJJAD ELAHI

196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN

LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم ازکم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org

Website: www.shibliacademy.org

Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh

Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100

✆ (Office Mobile) 09170060782

عبدالمنان ہلالی (جوائنٹ سکریٹری؍منیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۹۹ — ماہ ربیع الثانی ۱۴۳۸ھ مطابق ماہ مارچ ۲۰۱۷ء — عدد ۳

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

ماہ نامہ الندوہ کو علامہ شبلی کے علمی اور ملی کارناموں میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔اسی کے ساتھ ساتھ ندوۃ العلماء کے مقاصد کی تکمیل اور ان کی توسیع و اشاعت کے میدان میں بھی اس نے بڑی وقیع خدمات انجام دی ہیں۔اپنی مختصر سی زندگی میں اس نے جو کامیابی حاصل کی وہ ہر لحاظ سے غیر معمولی تھی۔طبقہ علماء کے علاوہ جو اس کے اصل مخاطب تھے،عام پڑھے لکھے لوگوں کو بھی اس رسالہ نے جس طرح متاثر کیا اردو صحافت کی تاریخ میں اس کی مثالیں کم ہیں۔اس کے ذریعہ علامہ شبلی کے فیضِ تربیت سے ایسے اہل قلم تیار ہوئے جو اس میدان میں یگانۂ روزگار ثابت ہوئے اور ان کی نگارشات سے ایک عالم مستفید ہوا۔علامہ شبلی کو مولانا عبدالماجد دریابادی نے مصنف گر کے لقب سے یاد کیا ہے۔ان کی مصنف گری کا سب سے اہم ذریعہ یہی مجلہ تھا۔اس رسالہ کے ذریعہ انہوں نے جن اہل قلم کی تربیت کی ان میں مولانا ابوالکلام آزاد،مولانا سید سلیمان ندوی،مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا عبداللہ العمادی جیسی منتخب روزگار شخصیات شامل تھیں۔مولانا سید سلیمان ندوی اس مجلہ کے اثرات اور نتائج کے بارے میں لکھتے ہیں ''اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علماء کے سامنے جدید مباحث کا دروازہ کھلا،اسلام اور علوم اسلامیہ کی خدمت کے نئے طریقے ان کو نظر آئے،زبان و بیان کے انداز اور پیرائے ان کو معلوم ہوئے اور جو اس کو پسند کرتے تھے وہ بھی اور جو نہیں پسند کرتے تھے وہ بھی،اس کو پڑھ کر اس کے مطابق لکھنے کی کوشش کرنے لگے''۔یہ رسالہ علامہ شبلی اور مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کی مشترکہ ادارت میں جولائی ۱۹۰۴ء سے مئی ۱۹۱۲ء تک نکلتا رہا۔ندوہ سے علاحدگی سے دو مہینہ قبل علامہ اس کی ادارت سے الگ ہو گئے تھے۔ان کی علاحدگی کے بعد بھی یہ رسالہ کچھ دنوں تک نکلتا رہا لیکن اس کی وہ اہمیت باقی نہیں رہی۔یہ رسالہ ہماری علمی اور ملی تاریخ کا ایک گراں مایہ ورثہ ہے لیکن اب یہ گردش ایام سے کم یاب ہی نہیں بلکہ نایاب ہو چکا ہے۔اس کی تاریخی قدر و قیمت اور علامہ شبلی کی ایک اہم علمی وراثت ہونے کی وجہ سے سلسلہ شبلی صدی مطبوعات کے تحت اس کا عکسی ایڈیشن شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا تاکہ یہ اہم تاریخی دستاویز محفوظ بھی ہو جائے اور شائقین کو دستیاب بھی۔لیکن ایک صدی پرانے اس مجلہ کو عکسی ایڈیشن کے لیے تیار کرنے کا مرحلہ آسان نہیں تھا۔اس کی مکمل فائل

کے حصول میں بھی گونا گوں مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ایک صدی کا طویل عرصہ گذر جانے کی وجہ سے کاغذ کا رنگ بدل چکا تھا اور اس کی وجہ سے عکس غیر واضح اور ناصاف تھا اور اس لائق نہیں تھا کہ اسے شائع کیا جاسکے۔ضرورت تھی کہ جدید ٹکنالوجی کی مدد سے اسے صاف کیا جائے اور اسے قابل اشاعت بنایا جائے۔ یہ بہت طویل، صبر آزما اور محنت طلب کام تھا۔ ہمیں بے حد خوشی ہے کہ اس کام میں وقت تو بہت لگا اور زحمت بھی بہت اٹھانی پڑی لیکن یہ پورا عمل اکیڈمی کے کمپیوٹر سکشن میں انجام پایا۔ بڑی محنت و مشقت اور دماغ سوزی کے بعد جب عکس اشاعت کے لائق ہوگیا تو وسائل کی کمی سدّراہ بن گئی۔ وسائل کی شدید قلت کی وجہ سے جس طرح اکیڈمی کے دوسرے بہت سے کام رکے ہوئے ہیں اسی طرح یہ کام بھی تعویق میں پڑ گیا۔اب اللہ کے فضل سے اس کی پہلی دو جلدیں چھپ گئی ہیں اور ہم نہایت خوشی سے انہیں شائقین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں، باقی سات جلدیں جیسے جیسے وسائل دستیاب ہوتے جائیں گے چھپتی جائیں گی البتہ اس کام کی تکمیل میں کتنا وقت لگے گا اور بقیہ جلدوں کے لیے آپ کو کتنا انتظار کرنا پڑے گا اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔

معارف صدی کی مناسبت سے جو منصوبے پیشِ نظر تھے ان کی تفصیل ان اوراق میں دی جاچکی ہے۔ان میں سے ایک اہم منصوبہ معارف کی توسیعِ اشاعت سے متعلق تھا۔سوسال کے طویل، باثمر اور صبر آزما سفر کو اس شان اور کامیابی سے مکمل کرنے کی مناسبت سے اور اس کی غیر معمولی خدمات اور امتیازات کے اعتراف کے طور پر اس کا بجا طور پر یہ حق تھا کہ قدردانانِ دارالمصنّفین اور محبّان اردو اردو صحافت کی اس عظیم الشان حصول یابی کا شایانِ شان استقبال کرتے اور اردو دنیا کے طول وعرض میں اس کا جشن مناتے۔لیکن نہایت رنج وافسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہر طرف مکمل سناٹا ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس دوران اردو صحافت کے موضوع پر بعض سیمینار بھی ہوئے لیکن اردو کے تنہا سو سال کا سفر مکمل کرنے والے علمی وادبی مجلہ اور اس کی بے مثال خدمات کا کوئی ذکر نہیں آیا۔رسائل اور اخبارات بھی اس کے ذکر سے یکسر خالی رہے ہیں۔اس کا سبب لاعلمی ہے یا تغافل یقین سے کہنا مشکل ہے۔معارف کے قدردانوں کی طرف سے بھی کسی طرح کی حوصلہ افزائی کا ظہور نہیں ہوا۔گذارش کی گئی تھی کہ معارف کا ہر خریدار کم از کم ایک نیا خریدار بنائے۔معارف سے

ان کے تعلق خاطر کی وجہ سے ان سے اس سے زیادہ کی امید تھی لیکن معارف صدی سال کے آٹھ مہینے گذر چکے ہیں اور ہنوز اس سلسلہ میں کوئی پیش رفت نظر نہیں آئی۔ اس صورت حال میں ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں:

دے دل ان کو اور جو نہ دے مجھ کو زباں اور

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی نے جو عظیم الشان لٹریچر تیار کیا ہے وہ تقریباً پورا کا پورا اردو زبان میں ہے۔ اس کی اہمیت اور افادیت کے پیشِ نظر یہ ضرورت برابر محسوس کی جارہی تھی کہ اسے دوسری زبانوں میں بھی منتقل کیا جائے۔ علم ودانش کی وسیع تر دنیا تک اس کو پہنچانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ کیا جائے۔ آج جب کہ خود مسلمانانِ ہند کی نئی نسل اردو سے ناواقف ہوتی جارہی ہے اس لٹریچر کو ہندی میں منتقل کرنے کی ضرورت شدت اختیار کر چکی ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری نئی نسل اپنی تاریخ اور تہذیب وثقافت سے یکسر بیگانہ نہ ہوجائے تو ان کی ذہنی، علمی اور فکری تربیت اور رہنمائی کے لیے یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ ان کے لیے اس زبان میں لٹریچر فراہم کیا جائے جس سے وہ واقف اور آشنا ہیں۔ ورنہ یہ نسل دھیرے دھیرے اپنی جڑوں سے کٹ جائے گی۔ مزید براں دارالمصنّفین کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اسلام اور مسلمانوں کے سلسلہ میں الزامات اور غلط فہمیوں کا تدارک کیا جائے۔ اس موضوع پر بھی دارالمصنّفین میں بنیادی اہمیت کا کام ہوا ہے۔ لیکن یہ سارا سرمایہ اردو میں ہے اور اس وجہ سے ان لوگوں تک نہیں پہنچ سکا جو اس کے مخاطب ہیں۔ اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے شبلی اکیڈمی نے وسائل کی شدید قلت کے باوجود محض اللہ کی مدد کے سہارے اس کام کی ابتدا کردی ہے۔ ہندی میں اب تک اللہ کے فضل وکرم سے نصف درجن سے زیادہ کتابیں ترجمہ ہوکر چھپ چکی ہیں۔ ان میں الفاروق، سیرت عائشہ، رحمت عالم، دین رحمت، خطبات مدراس، ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کی مذہبی رواداری (تین جلدیں) شامل ہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ اسلام (چار جلدیں)، اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر اور بعض دوسری کتابوں کا ترجمہ ہوچکا ہے اور محض وسائل کی قلت کی وجہ سے ان کی اشاعت کا کام رکا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ رحمت عالم، خطبات مدراس اور سیرت عائشہ کا انگریزی ترجمہ بھی مکمل ہوچکا ہے اور اشاعت کا منتظر ہے۔

مقالات

حافظ ابن حجر العسقلانی اور ان کا نادر نسخہ "ہدی الساری" (نسخۂ کاندھلہ)

مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی

(۲)

حافظ کے ایک ہندوستانی استاذ: برصغیر کے مسلمانوں کے لئے یہ شرف وافتخار اور اعزاز کی بات ہے کہ حافظ کے ممتاز اور نمایاں استادوں میں سے ایک استاذ، ہندی یا ہندی الاصل تھے، جن سے حافظ نے بہت کچھ پڑھا اور سیکھا ہے، یہ تھے:

شیخ ابوالمعالی، عبداللہ بن عمر بن علی بن المبارک الازہری الحلاوی ہندی ولادت ۷۲۸ھ (۱۳۲۸ء) وفات ۸۰۷ھ (۱۴۰۴ء)۔ شیخ ابوالمعالی کے نام کے ساتھ خود حافظ نے صرف ہندی لکھا ہے اور نسبت حلاوی کی بمهملة و لام حفيفة سے وضاحت بھی فرمادی ہے۔(۱)

شیخ ابوالمعالی الحلاوی حافظ کے ان چار بڑے استادوں میں شمار کیے جاتے ہیں، جن سے حافظ نے خاص استفادہ کیا۔ حافظ نے المجمع المؤسس میں ان تمام کتابوں اور سندوں کا جو شیخ الحلاوی سے پڑھی ہیں۔ تفصیل سے ذکر کیا ہے، شیخ کی محفل میں پڑھی اور سنی ہوئی کتابوں کی یہ فہرست المعجم المؤسس کے مطبوعہ نسخہ میں پچیس صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، جس سے حافظ کے علمی مقام اور حدیث میں وسعت نظر اور ان کی تصانیف کے بڑے خزانہ پر الحلاوی الہندی کے اثرات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔(۲)

عہدہ اور منصب: حافظ عہدہ اور منصب کے کبھی خواہش مند نہیں رہے، اس لیے جب قاضی صدر المناوی نے حافظ کو نائب قاضی اور اپنا قائم مقام بنانا چاہا تو حافظ نے اس کو قبول نہیں کیا، مگر

مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، مولویان، کاندھلہ، شاملی (مظفر نگر) یوپی۔ Email:nhrashidkandhlavi@yahoo.com

اس کے بعد جب حاکمان وقت نے اصرار کیا اور دباؤ ڈالا تو مجبوراً عہدۂ قضاۃ قبول کر لینے کے لیے تیار ہو گئے۔ وہ چھ مرتبہ قاضی بنائے گئے، سب سے پہلے ۲۶ محرم الحرام ۸۲۷ھ (دسمبر ۱۴۲۳ء) میں جب قاضی علم الدین بلقینی (۷۹۱ھ۔ ۸۹-۱۳۸۸ء/ ۸۶۹ھ۔ ۶۵-۱۴۶۴ء) کو عہدہ سے معزول کیا گیا تو ان کی جگہ حافظ کو قاضی مقرر کیا گیا، اس کے بعد وقفہ وقفہ سے کئی مرتبہ اس کے لیے منتخب کیے گئے۔ (۳) مگر اس عہدہ سے دل بستگی نہ ہونے اور اس سے کسی طرح کے دنیاوی فائدہ حاصل نہ کرنے کے فیصلہ کی وجہ سے اس سے علاحدہ بھی ہوتے رہے۔ (۴)

وہ کل اکیس سال چند مہینے قاضی رہے، وفات سے چھ مہینے قبل آخری چھٹی مرتبہ منصب قضا کو ترک کیا۔ ارادہ یہ تھا کہ آئندہ کبھی اس خدمت و منصب کو قبول نہیں کریں گے اور یکسوئی سے تصنیف و تالیف درس و افادہ میں مشغول رہیں گے، مگر اجل نے اس کے بعد زیادہ مہلت نہ دی، آخری مرتبہ عہدۂ قضا سے علاحدگی ۲۵ جمادی الاخریٰ ۸۵۲ھ (اگست ۱۴۴۸ء) کے بعد اپنے گھر میں تصنیف و تحریر کے لیے فارغ ہو کر بیٹھے تھے، لیکن اسی سال کے آخر میں ذی الحجہ ۸۵۲ھ (فروری ۱۴۴۹ء) میں سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

سفر حج: حافظ ابن حجر کو زیارت حرمین کا سب سے پہلا موقع اور سفر حج کی پہلی سعادت اس وقت نصیب ہوئی تھی، جب وہ قریب بارہ سال کے تھے۔ یہ سفر ۷۸۵ھ (فروری ۱۳۸۳ء) میں حافظ کے ولی اور مربی شیخ زکی الخروبی کے ساتھ ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بھی حافظ نے اپنے والد اور ولی شیخ خروبی کے ساتھ مکہ مکرمہ کے کئی سفر کیے۔

ذی الحجہ ۸۰۰ھ (اگست ۱۳۹۸ء) میں حج اسلام (؟) کیا، پھر ۸۰۵ھ (۱۴۰۳ء) میں حج کا موقع ملا، مگر سخاوی کہتے ہیں کہ یہ حج ۸۰۶ھ (۱۴۰۴ء) میں ہوا تھا، اس کے بعد ۸۱۵ھ (۱۴۱۳ء) میں اور پھر ۸۲۴ھ (۲۱-۱۴۲۰ء) میں بھی حج کیا، یہ آخری سفر حج تھا۔

یہ تمام سفر حافظ کے لیے حقیقی معنوں میں علمی کامیابیوں، بڑے علماء، اساتذۂ محدثین اور مشائخ کبار کی ملاقاتوں، صحبتوں اور ان سے اخذ و اجازت کے لحاظ سے وسیلہ ظفر ثابت ہوئے۔ یعنی ہر سفر حافظ کے مراتب و کمالات میں اضافہ کا ذریعہ، علوم و اجازات پر نظر اور اعلیٰ کتابوں کی قرات و سماعات کے لیے بہترین موقع اور بلند سے بلند پرواز کا میدان بنا۔

ازواج واولاد: حافظ ابن حجر کا نکاح تقریباً پچیس سال کی عمر میں قاضی کریم الدین بن عبدالعزیز کی بیٹی (انس) سے ۷۹۷ھ (۹۵-۱۳۹۴ء) میں ہوا تھا، انس فاضل خاتون تھیں، اپنی لیاقت اور علمی ذوق کی وجہ سے حافظ کی علمی خدمات ومعاملات میں مددگار ومعاون ثابت ہوئیں، محترمہ نے حافظ کے استاد شیخ عبدالرحیم عراقی سے المسلسل بالاولیۃ پڑھی، حافظ نے ان کے لیے متعدد ائمہ اور علمائے محدثین سے اجازتیں اور سندیں حاصل کیں تھیں۔(۵)

حافظ نے ایک اور نکاح لیلیٰ بنت محمود بن طوعان الحلبیہ سے ۸۳۶ھ (۳۳-۱۴۳۲ء) میں حلب میں کیا تھا، یہ حسن ظاہر وباطن اور فہم ودانش میں ممتاز تھیں۔ لیلیٰ حافظ کی حقیقی مونس وغمگسار تھیں، اس وجہ سے بھی اور اپنے کمالات خلقی و خُلقی کے سبب بھی۔ حافظ کو ان سے بہت ہی شیفتگی اور محبت تھی، حافظ نے ان کی خوبیوں کا بڑی محبت سے تذکرہ کیا ہے اور ان کی تعریف میں اشعار کہے ہیں۔

حافظ کی کل چھ اولادیں تھیں، ایک فرزند پانچ لڑکیاں: زین خاتون، فرحت، عالیہ، رابعہ، فاطمہ۔ فرزند بدرالدین محمد تھے۔ حافظ ان کی آسائش، تعلیم وتربیت اور بہتر زندگی کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ حافظ کے خاندان کی بعض خواتین اور دختران بھی باکمال اور ذی علم تھیں، لیکن فرزند بدرالدین محمد، والد کی بھرپور توجہ، بے انتہا محبت ورہنمائی کے باوجود، باپ کے علمی مرتبے کو نہ پا سکے۔ بلکہ سخاوی کی اطلاع کے مطابق بدرالدین محمد نے حافظ کے علمی ذخیرہ اور تصانیف وغیرہ کے محفوظ کرنے کا بھی کچھ اہتمام نہیں کیا۔ حافظ کی تصانیف کے مسودات اور حافظ کا کتب خانہ بدرالدین محمد کی زندگی ہی میں ضائع اور منتشر ہوگیا تھا۔ وکان امر اللہ قدراً مقدوراً۔

وفات: شیخ الاسلام والمحدثین حافظ ابن حجر نے علم وعمل، علوم اسلامیہ، خصوصاً حدیث وفقہ کی خدمت، درس وافادہ، تحریر وتصنیف، عہدہ ومنصب، عزت وشہرت، ہر طرح سے نہایت اعلیٰ، کامیاب اور بھرپور زندگی گزاری۔ حافظ دینی خدمات اور علمی کاموں میں مشغول تھے کہ ذی قعدہ ۸۵۲ھ (جنوری ۱۴۴۸ء) میں بیمار ہوئے، بیماری کے باوجود اپنے تمام معمولات جاری رکھے۔ ۲۵/ ذیقعدہ کے بعد بیماری بڑھ گئی، درس وافادہ کی طاقت نہیں رہی، یہاں تک کہ عیدالاضحیٰ کی نماز کے لیے بھی جانے کی ہمت وقوت نہ تھی، عمدہ علاج کے باوجود صحت نہ ہوئی اور اسی ذی الحجہ کے مہینہ میں لیلۃ السبت ۸۵۲ھ (۱۴۴۸ء) میں دنیا کا یہ نادر روزگار عالم ومحدث، عالم آخرت کے سفر پر روانہ ہوگیا، وفات کی

صحیح تاریخ میں اہل تذکرہ کا اختلاف ہے کہ یہ لیلۃ السبت ۱۹؍ذی الحجہ تھی یا ۲۸؍ذی الحجہ، مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ ۸۵۲ھ اور ذی الحجہ کا مہینہ تھا۔(۶)

جنازہ میں پچاس ہزار سے زائد افراد نماز جنازہ میں شریک تھے۔ جنازہ پر بادل تھے اور ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

علامہ عبدالحی کتانی (مولف فہرس الفہارس وغیرہ) کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کتانی کے دور تک (۱۳۴۵ھ۔۱۹۲۶ء) حافظ کے مدفن پر بڑی وسیع عمارت موجود تھی۔ کتانی اپنا مشاہدہ لکھتے ہیں:

"وزرت قبره وعليه بناء ضخم"(۷)

دکتور شاکر عبدالمنعم نے لکھا کہ حافظ کا مزار حضرت امام شافعیؒ کے مدفن سے تقریباً ایک ہزار پانچ سو (۱۵۰۰) میٹر کے فاصلہ پر ہے اور اسی کے قریب صحابی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عقبہ بن عامرؓ کا مزار بھی ہے۔

دکتور شاکر محمود عبدالمنعم نے حافظ کے مزار کا مشاہدہ تفصیل سے لکھا ہے، حافظ کی قبر کے کتبہ کے الفاظ بھی نقل کیے ہیں، جو یہ ہیں:

وهذا قبر احمد بن علی بن حجر العسقلانی۔(۸)

هيهات لايأتى الزمان بمثله ان الزمان بمثله لبخيل

افسوس ہے کہ اب اس محدث جلیل کا مدفن گم نام ہے، مقامی لوگ بھی اس کے متعلق کم جانتے ہیں اور اس کی ایسی کوئی پہچان بھی نہیں کہ فاتحہ پڑھنے کے لیے آنے والے آسانی سے وہاں پہنچ جائیں۔

ہندو پاکستان کے عہد حاضر کے ایک بڑے ممتاز عالم، مولانا مفتی محمد تقی عثمانی بھی وہاں پہنچے تھے، لیکن حافظ کی مسجد تک پہنچ کر رہ گئے، حافظ کے مدفن کا مقامی لوگوں سے بھی پتہ نہ ملا، حالانکہ مولانا محمد تقی عثمانی کی رہنمائی، شام کے مشہور عالم ڈاکٹر حسن الشافعی کر رہے تھے، جو اس دیار میں کئی

مرتبہ آچکے تھے۔

مولانا تقی عثمانی اگرچہ حافظ ابن حجر کے مدفن تک نہیں پہنچ سکے، لیکن انہوں نے حافظ کی اس مسجد میں حاضری دی، جس میں حافظ نماز پڑھتے اور درس دیتے تھے، یہ مسجد آج تک حافظ ابن حجر کے نام سے متعارف ہے۔ مولانا نے اپنے سفرنامہ میں اس کا مختصر تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ازہر سے فارغ ہوئے تو نماز ظہر میں کچھ وقت باقی تھا، میں نے اپنے رہنما ڈاکٹر حسن الشافعی سے بہت پہلے کہہ رکھا تھا کہ میں، حافظ ابن حجرؒ کے مزار پر بھی حاضر ہونا چاہتا ہوں، ڈاکٹر صاحب نے کہا، نماز انہیں کی مسجد میں ادا کرلی جائے۔ چنانچہ ازہر سے نکل کر ہم جامع الحسین (۹) کے سامنے کچھ تنگ وتاریک گلیوں سے ہوتے ہوئے ایک طویل سڑک پر آگئے، جو جامع الحاکم پر جاکر ختم ہوئی ہے۔ یہ بھی پرانے قاہرہ کی سڑک ہے جو اس وقت تو شاہراہ رہی ہوگی، لیکن اب بہت تنگ معلوم ہوتی ہے۔ اس کے دونوں طرف قدیم طرز کا بازار چلا گیا ہے۔ تقریباً ایک ڈیڑھ کلومیٹر چلنے کے بعد، بائیں ہاتھ پر ایک طویل گلی تھی، ڈاکٹر حسن الشافعی خود ایک عرصہ کے بعد یہاں آئے تھے، اس لیے انہیں بہت سے لوگوں سے پتہ پوچھنا پڑا۔ بالآخر اس گلی کے آخر سرے کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد نظر آئی، یہ ''مسجد الحافظ ابن حجر'' تھی۔ پہلے ڈاکٹر شافعی کا خیال یہ تھا کہ حافظ ابن حجرؒ کا مزار اسی مسجد میں واقع ہے، لیکن وہاں کوئی مزار نہیں تھا۔ مسجد کے خدام نے بتایا کہ ان کا مزار یہاں نہیں ہے، لیکن یہ مسجد انہی کی ہے، جس میں وہ نماز بھی پڑھتے تھے اور درس بھی دیتے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان کا مزار قرافہ میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مزار کے سامنے واقع ہے، جہاں ہم کل ہو آئے تھے۔ زمانۂ حال میں حافظ ابن حجرؒ کے ایک تذکرہ نگار ڈاکٹر شاکر محمود عبدالمنعم لکھتے ہیں:

''حافظ ابن حجر کا مزار سید عسل کے قرافہ کے پیچھے واقع ہے، اس کے بالمقابل حضرت عقبہ ابن عامرؓ کا مزار ہے، افسوس ہے کہ یہ قبر بے توجہی کا شکار ہے۔ یہ ایک چھوٹے سے کمرے میں واقع ہے، جو مستطیل شکل میں ہے اور زمین سے قدرے بلند ہے، اس کے چاروں گوشوں پر چار بلند ستون ہیں، جن کی شکل اوپر جاکر مخروطی ہوگئی ہے، قبر کے سرہانے ایک دھندلا سا کتبہ ہے، جس پر یہ عبارت میں پڑھ سکا:

''ھذا قبر احمد بن علی بن حجر العسقلانی'' (۱۰)

بہرکیف! اس مزار پر تو حاضری نہیں ہوسکی، لیکن اس مسجد میں نماز ظہر پڑھنے کا موقع ملا۔ یہ ایک چھوٹی سی مسجد ہے، جو اس وقت خستہ حال ہے، لیکن اب اس کی مرمت ہورہی ہے، جس مسجد کو حافظ ابن حجرؒ جیسے علم کے دریائے ناپیدا کنار نے، اپنی فیض رسانی کا مرکز بنایا ہو، اپنے عہد شباب میں وہاں تشنگان علم کے ازدحام کا کیا عالم ہوگا حافظ ابن حجر کے تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مکان بھی اسی محلے میں، کہیں آس پاس تھا۔(۱۱)

تصانیف ومولفات : علوم وفنون میں غیر معمولی وسعت نظر، مباحث واصول میں مہارت استحضار اور زبان وتحریر پر خاص قدرت کا تقاضہ، بلکہ حق تھا کہ حافظ تحریر وتالیف پر پوری پوری توجہ فرمائیں اور دنیا کو اپنے علوم سے مالا مال کردیں۔

حافظ ابن حجر نے اوائل عمر سے تصنیف وتالیف پر توجہ فرمائی، اگرچہ اساتذہ کے افادات اور محدثین کے اسباق وروایات جمع کرنے کا عمل زمانہ تعلیم سے جاری ہوجاتا ہے، مگر اس کو باضابطہ تصنیف وتالیف میں شمار نہیں کیا جاتا، اس لیے حافظ کے ابتدائی افادات اور درس کے امالی بھی جو بعد میں معروف ہوئے، تالیفات وتصنیفات کی فہرست میں شامل نہیں کیے گئے۔

ان کی تصنیف وتحریر کا غالباً ۷۹۵ھ (۱۳۹۲ء) میں آغاز ہوا (۱۲)، حافظ کے عزیز ترین شاگرد اور علمی کمالات میں جانشیں علامہ سخاوی نے حافظ کی تصانیف ومولفات کی جو فہرست مرتب فرمائی ہے، اس میں سب سے پہلا نام مختصر تلبیس ابلیس ابن جوزی کا ہے۔ حافظ نے لکھا ہے کہ اس کی تلخیص سے وہ ۷۹۵ھ (۱۳۹۲ء) میں فارغ ہوئے، اسی طرح ایک اور کتاب مقدمۃ فی العروض ہے۔

مختصر تلبیس ابلیس ابن جوزی اور مقدمہ فی العروض، یہ دونوں ۷۹۵ھ (۱۳۹۲ء) کی یادگار ہیں، اس کے بعد القزفی اور دکتور شاکر محمود دونوں کی تصنیف وتحقیق میں "المائۃ العشاریہ" کا تذکرہ ملتا ہے، جو ۷۹۷ھ (۱۳۹۴ء) میں مرتب ہوئی تھی، مگر ان دونوں نے علوم وادب ولغت کے تحت حافظ کے ابتدائی دور کی سب سے طویل وضخیم کتاب: "**مسامر الساهر و مساهر السامر**" کا اہمیت سے ذکر کیا ہے۔ **مسامر الساهر** عربی شعراء کا انتخاب تھا، جو چالیس جلدوں پر مشتمل تھا، حافظ کے قلم سے، اس کا ایک مکمل نسخہ، الملک الاشرف حاکم یمن کو ہدیہ کیا گیا تھا، اس کی بعض جلدوں پر تالیف و تحریر کا سن ۷۹۴ھ (۹۲-۱۳۹۱ء) اور بعض پر ۷۹۵ھ (۹۳-۱۳۹۲ء) لکھا ہوا تھا، اس کی چند جلدیں

علامہ سخاوی نے مکہ مکرمہ میں دیکھی تھیں۔(۱۳)

اس کے بعد حافظ کا قلم جو رواں ہوا تو اس شان سے کہ اس سفر میں ان کے دور میں اور ان کے بعد بھی، تمام عالم اسلام میں سے کوئی بھی مجموعی طور پر حافظ کا ہم پایہ اور مقابل نہیں رہا۔ اسی وجہ سے علامہ تاج الدین الغرابیلی کی اس بات سے اختلاف کی غالباً گنجائش نہیں ہے کہ:

"انہ ما رأی مثلہ و لا رأی ھو مثل نفسہ و انہ ما دخل الیٰ دمشق بعد ابن عساکر اجل منہ و لا مثلہ"۔(۱۴)

حافظ کی تصانیف وجود میں آنی شروع ہوئیں جو جملہ علماء اور محدثین کرام کے لیے علم و بحث و استدلال اور تنقید و تحقیق کا ایسا بے نظیر اور لازوال سرمایہ ہیں، جس کی کامل تعریف و توصیف ممکن ہی نہیں۔

نہ حسنش غایتے دارد، نہ سعدی را سخن پایاں

علم حدیث میں روایت و درایت حدیث، رجال اور متعلقات حدیث، مباحث اختلافات اور ان میں قول فیصل، ہر ایک کے لیے حافظ ابن حجر سے کتابوں کی تصانیف سے رجوع کرنا ضروری ہوگیا۔

ان کی تصانیف و مولفات کی فہرست طویل بھی ہے اور وقیع اور باوزن بھی، ان میں وہ کتابیں بھی ہیں جو بالکل مکمل ہیں، وہ بھی ہیں جو نظر ثانی کی منزل میں تھیں، تسوید مکمل نہیں ہوئی تھی۔ حافظ کی تصانیف و مولفات کی کل کیا تعداد ہے، اس میں قدیم تذکرہ نگاروں کی تحریروں میں اختلاف ہے، کسی نے سو کسی نے ڈیڑھ سو یا کم زائد تصنیفات کی بات کی ہے۔ جامع ترین مفصل فہرست جو ان کتابوں اور تصنیفات کے نسخوں کی بھی بڑی حد تک نشاندہی کرتی ہے، دکتور شاکر محمود عبدالمنعم نے مرتب کی ہے، اس فہرست میں حافظ کی تین سو بیس کتب و مولفات کے نام شامل ہیں، جس میں دو سو بیاسی حافظ کی معلوم و محقق تصانیف و کتب ہیں، اڑتیس کتابیں ایسی ہیں جو حافظ سے منسوب کی جاتی ہیں، مگر یہ تحقیق طلب ہیں۔(۱۵)

سب سے بڑا ذخیرہ، حدیث کی کتابوں خصوصاً صحیح بخاری کی تصحیح اور شروحات و متعلقات کا ہے۔ حافظ کی صحیح بخاری کے حوالہ سے چار تصانیف ہیں: تغلیق التعلیق، ہدی الساری، شرح کبیر صحیح بخاری اور فتح الباری، چاروں میں پہلی تصنیف تغلیق التعلیق ہے۔ تغلیق التعلیق کا تعارف کراتے

ہوئے اس کے محقق شیخ عبدالرحمان موسیٰ القرنی نے لکھا ہے:

"وهو كتاب كثير الفوائد، يشتمل على وصل التعاليق المرفوعة و الآثار الموقوفة و المقطوعة، و ما أشبه ذٰلك من قوله تابعه فلان ورواه فلان، الواقعة في صحيح البخاري بأسانيده إلى من علق عنه و لم يفته من ذلك الا القليل۔ فجاء كتابا حافلاً جامعا كاملاً، لم يسبق إلى مثله، و لم يفرده احد بالتصنيف"۔ (۱۶)

اور دکتور شاکر محمود عبدالمنعم نے صراحت کی ہے:

"لم يسبق إلى مثل هذا التصنيف و لم يتعرض لشيء منه إلاّ في النادر"

اور علامہ سخاوی کے حوالہ سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ:

"و قف عليه أكابر شيوخه و شهدوا بأنه لم يسبق إليه، و كان عمله أن يسوق التعاليق المرفوعة و الآثار الموقوفة في الجامع الصحيح للبخاري ويشير إلى من وصلها بأسانيده هو إلى المكان المعلق، فخرج كتاباً حافلاً و جامعاً و كاملاً لم يفرده أحد بالتصنيف، ورافق ذلك جمع طرق الحديث ووصل منقطعه، و تعيين درجته و استعان به كثيراً في الفتح، حيث قال، "فإنه أغنى عن تعب كثير" و لم يفته من وصل ذلك إلا القليل، و هو له معجزة"۔ (۱۷)

حافظ اپنی تصانیف میں سے، چند کتابوں کو ممتاز اور حاصل زندگی سمجھتے تھے، ان میں سے پہلی کتاب فتح الباری شرح صحیح البخاری ہے، اس کے بعد تغلیق التعلیق تھی۔ حافظ نے ہدی الساری میں ایک موقع پر تغلیق التعلیق کا تذکرہ کیا ہے، جس سے تغلیق التعلیق کی اہمیت و انفرادیت دونوں پر روشنی پڑتی ہے۔ صحیح بخاری کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"و ليس فيه من المتون التي لم تخرج في الكتاب و لو من طرق أخرىٰ، إلاّ مائة وستون حديثا، قد أفردتها في كتاب مفرد لطيف، متصل الأسانيد إلى من علق عنه، و جملة ما فيه من المتابعات و التنبيه على اختلاف الروايات ۱۳۴۱ حديثاً فجميع ما في الكتاب على هذا بالمكرر تسعة آلاف واثنان وثمانون حديثا، وهذه العدة خارج عن الموقوفات على الصحابة و المقطوعات عن التابعين فمن بعدهم، و قد

استوعبت وصل جميع ذلک في كتاب۔ ”تغليق التعليق“ وهذا الذي حررته من عدة مافي صحيح البخاری تحریر بالغ فتح اللّٰہ به، لا أعلم من تقدمنی إليه“۔ (۱۸)

تغلیق التعلیق کے خلاصے: حافظ نے تغلیق التعلیق کا ایک خلاصہ بھی مرتب کیا تھا، جس کو ”التشویق الی وصل المهم من التعلیق“ کے نام سے موسوم کیا، پھر اس کا بھی ایک اور اختصار کیا، اس کا نام: ”التوفیق الی وصل المهم من التعلیق“ رکھا۔

صحیح بخاری کی شرح کبیر اور اس کا مقدمہ: تغلیق التعلیق کی تکمیل کے بعد حافظ نے صحیح بخاری کی ایک مبسوط اور طویل شرح لکھنی شروع کی، اس میں شرح کے مشتملات ومضامین کی وضاحت کے لیے ایک گراں بہا اور علوم ونکات سے مالا مال، ایسا عمدہ مقدمہ لکھا، جس کی دنیائے حدیث میں نہ اس سے پہلے کوئی مثال تھی نہ اس کے بعد ہوئی۔ اسی مقدمہ کا نام: هدی الساري إلى مطالب صحيح البخاري ہے۔

حافظ ابن حجر نے اپنی کتاب ”انتقاض الاعتراض“ کی تمہید میں صحیح بخاری کے متعلق اپنی تمام تصانیف کا تذکرہ فرمایا ہے، جس سے ان سب کے متعلق ضروری صحیح معلومات مل جاتی ہیں، شرح کبیر صحیح بخاری کی تصدیق ہوتی ہے اور ہدی الساری اور فتح الباری کے سنین تالیف اور مدت تالیف، دونوں کا علم ہوجاتا ہے۔ حافظ نے تحریر فرمایا ہے:

فاني شرعت في شرح البخاري في سنة ثلاث عشرة وثمانمائة، بعد ان كنت خرجت باقية من الاحاديث المعلقة في كتاب سميته تغليق التعليق وكمل في سنة اربع وثمانمائة، ثم عملت مقدمة الشرح فكملت في سنة ثلاث عشرة المذكورة، ومن هناک ابتدأت في الشرح فكتبت منه قطعة، اطلت فيها التبيين ثم خشيت ان يعوق عن تكميله على تلک الصفة غايق، فابتدأت في شرح متوسط سميته فتح الباري بشرح البخاري۔ (۱۹)

محدث وفقیہ شاہ عبدالعزیز (بن الشاہ ولی اللہ) نے اپنی کتاب بستان المحدثین میں لکھا ہے:

وشرح دیگر ہم بر بخاری دارد، کلاں تراز فتح الباری، مسمی بہ ہدی الساری، ومختصر	اور بخاری پر دوسری شرح بھی ہے جو فتح الباری سے بڑی ہے، جس کا نام ہدی الساری ہے اور

آں شرح نیز دارد ولیکن ایں ہر دو، با تمام نہ رسیدہ۔(۲۰)	اس شرح کا ایک اختصار بھی ہے لیکن دونوں پوری نہیں ہوئیں۔

ہدی الساری: ہدی الساری فہم صحیح بخاری کی کلید اور فتح الباری کے مقاصد و مباحث کا گویا ایک آئینہ ہے، ہدی الساری کے ذریعہ سے صحیح بخاری کی مشکلات کے حل ہونے اور مراد مصنف تک پہنچنے کی ایک راہ نکل آئی ہے۔ دکتور شاکر محمود عبدالمنعم نے فتح الباری کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:

"وتشتمل على جميع مقاصد الشرح سوى الاستنباط وتنقسم على عشرة فصول"۔(۲۱)

حافظ کے ایک اور سوانح نگار عبدالستار الشیخ نے ہدی الساری کے تعارف میں خوب لکھا ہے:

كتاب فذ لا نظير له، ولا غنى لباحث عنه، تكلم فيه بكلام لم يسبق إليه وساق فيه فصولاً قيمةً فيها مباحث لا يمكن أن نظفر فی غیرها بها۔ وهو مفخرة له زاد شرحه للبخاری جلالاً وجمالاً۔(۲۲)

شروحات صحیح بخاری کے ایک وسیع النظر محقق عصام عرار الحسینی نے ہدی الساری کا تذکرہ نہایت عمدہ اور وقیع الفاظ میں اس کا تعارف کرایا ہے، لکھا ہے کہ:

"هدي الساري لمقدمة فتح الباري، وشهرتها وانفرادها بما اشتملت عليه من الفوائد الحديثية، والنكات الأدبية، والفرائد الفقهية، تغني عن الوصف، سيما وقد امتازت بجمع طرق الحديث التي ربما يتبين من بعضها، ترجيح أحد الاحتمالات شرحاً واعراباً، وطريقته في الأحاديث المكررة، أنه يشرح في كل موضع ما يتعلق بمقصد البخاري يذكره فيه، ويحيل بباقي شرحه على المكان المشروح فيه، وكذا ربما يقع له ترجيح أحد الأوجه في الاعراب أو غيره من الاحتمالات أو الأقوال في موضع، وفي موضع آخر غيره، الى غير ذلك مما لا طعن عليه بسببه، بل هذا أمر لا ينفك عنه أحد من الأئمة"۔ (۲۳)

اور تغلیق التعلیق کے محقق نے ہدی الساری کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا ہے:

"والكتاب مقدمة جليلة الشان، عظيمة الأثر، قد كتبت فی عشرة فصول،

تتمة لکتاب شرحہ الکبیر"۔ (۲۴)

حضرت مصنف حافظ ابن حجر نے ہدی الساری کا اس طرح تعارف کرایا ہے، جس میں اس کے مندرجات کا عطر سمٹ آیا ہے۔

حافظ نے سب سے پہلے یہ بتایا ہے کہ علوم اسلامیہ شرعیہ کی اصل اصول قرآن کریم اور سنت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہیں اور سیرت وسنت نبوی کی سب سے اعلیٰ ترجمانی صحیح بخاری میں کی گئی ہے، اس لیے میں نے صحیح بخاری کے فوائد کی وضاحت، اس کے مقاصد کی تشریح، اس کے مشکلات کے حل کے لیے کوشش کی ہے، جس سے اس کے مقدمات مرتب، اس کے فوائد واضح متعین ہوجائیں اور اس سے بہت زیادہ محنت کے بغیر زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جاسکے اور میری اس وضاحت وتالیف سے صحیح بخاری پڑھنے کے متمنی اصحاب کے دل، مقاصد صحیح بخاری کی تفہیم اور مطالب صحیح بخاری کی رسائی کے لیے کھل جائیں۔

حافظ نے ہدی الساری کے مشمولات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں اس کتاب میں دس بحثیں کروں گا:

ان میں سبب تصنیف، موضوع، تقطیع احادیث کی حکمت، معلقہ احادیث وآثار موقوفہ کی موجودگی، متون میں واقع غریب احادیث، مشکل اسماء، کنیتوں، انساب، مہمل انساب کے شیوخ، دارقطنی وغیرہ محدثین کے نقد، مطعون اسماء اور باب درباب کتاب کی فہرست وغیرہ کا ذکر ہے۔ (۲۵)

ہدی الساری اپنی جامعیت کے لحاظ سے ایک گراں بہا علمی تحفہ بن گئی۔ اس کی نقلوں اور درس واجازات کا بہت اہتمام ہوا، یوں یہ کتاب مشرق ومغرب میں پھیلتی چلی گئی۔

حافظ کی ایک اور تالیف "ہدایۃ الساری فی سیرۃ الامام البخاری": حافظ کی تصانیف کی فہرست میں ہدی الساری کے نام سے ملتا جلتا ایک اور نام "ہدایۃ الساری" بھی ہے۔ یہ حافظ ابن حجر کی ایک نسبتاً غیر متعارف تصنیف ہے جو امام بخاری کے احوال ومناقب پر لکھی گئی، اس کا پورا نام "ہدایۃ الساری فی سیرۃ الامام البخاری" ہے۔ اس میں امام بخاری کے احوال پر امام محمد بن حاتم رازی کی وراقہ تالیف: "شمائل الامام البخاری" کی تلخیص کی گئی ہے کتاب کے آغاز پر ابن ابی حاتم رازی کی اس کتاب کی سند بھی ہے۔ لکھا ہے کہ:

فهذه نبذة من اخبار الامام، ابي عبدالله البخاري منبهة على قدره وتفخيم على أمره، وان كان أمره شهيراً وقدره اثيرا، لكن في التفصيل ماليس في المجمل، فقد أوردتها مختصرة الاسناد غالباً، وكثيرا ما أوردته فمن كتاب شمائل البخاري، تاليف ورّاقة الامام أبي جعفر محمد بن أبي حاتم الرازي۔

وقد أخبرني بجميعه، ابو محمد عبدالله بن محمد المكي، اذناً مشافهةً عن عبدالعزيز بن بلخا۔

اس رسالہ یا تالیف کا، حافظ کے ان الفاظ پر اختتام ہوا ہے:

علقها جامعها محمد بن علي بن العسقلاني، وكان تاريخها وتبييضها فى الجمعه الثالث شهر رمضان، سنة خمسين وثمانمائة ــ والحمد لله الذي هدانا لهذا، وصلى الله على سيدنا محمد وآله وسلم وحسبنا الله وكفىٰ۔

مگر حافظ نے اس سلسلۂ اجازت اور شیخ عبداللہ بن محمد مکی کا اپنی فہرست مشائخ واجازات: **المعجم المفهرس** میں تذکرہ نہیں کیا۔

ہدایۃ الساری اور ہدی الساری کے ناموں کی مشابہت کی وجہ سے کئی اہل علم کو مغالطہ ہوا ہے، انہوں نے دونوں کو ایک سمجھ لیا ہے، جو صحیح نہیں ہے۔(۲۶)

ہدایۃ الساری کا ایک قدیم، عمدہ خطی نسخہ حبیب گنج کلکشن، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (یوپی، انڈیا) میں محفوظ ہے، اس پر کاتب کا نام، سنہ کتابت یا کوئی اور ایسی علامت موجود نہیں، جس سے اس کے زمانۂ کتابت کا علم ہوتا ہو۔ اندازاً تین سو سال پرانا نسخہ ہے، چھوٹے سائز کے پچیس اوراق پر مشتمل ہے، عموماً فی صفحہ اکیس سطور ہیں، خط نستعلیق ہے۔

مطبوعہ ہدایۃ الساری کو حسنین سلمان مہدی نے ایک خطی نسخہ سے مرتب کیا ہے۔ جو دارالبشائر الاسلامیہ سے چھپا ہے۔ مرتب کی صراحت کے مطابق اس تصحیح متن کے لیے جس نسخہ پر اعتماد کیا گیا ہے، اس کو مصنف (حافظ ابن حجر) کے شاگرد صدرالدین احمد بن محمد بن عبداللہ بن احمد بن عبدالمحسن الکتانی الزخناوی الشافعی نے مصنف کے نسخہ سے نقل کیا تھا، ۹؍ربیع الاول ۸۹۵ھ (جنوری ۱۴۹۰ء) میں اس کی نقل وکتابت مکمل ہوئی تھی۔

مگر اس کے ساتھ ہی فاضل مرتب کا یہ بھی کہنا ہے کہ اصل نسخہ میں سقطات، تحریفات اور فروگذاشتیں وغیرہ فنی کمزوریاں تھیں، جن کو محقق نے درست کر دیا ہے۔ اگر استاذ حسنین مہدی کے پیش نظر نسخہ مولف کی نقل یا مصنف کے کسی شاگرد کے قلم کا نسخہ ہے، تو اس کی نقل میں سبقت قلم یا بعض فروگذاشتوں کا رہ جانا ممکن ہے، مگر تصحیف وتحریف اور سقطات کی بات قابل قبول معلوم نہیں ہوتی۔ نسخہ علی گڑھ اگرچہ تحریر وکتابت میں مصنف سے، کچھ نسبت نہیں رکھتا، مگر نسخہ صاف ستھرا ہے اور سقطات وتحریفات سے بظاہر، بڑی حد تک پاک ہے۔

ہدی الساری حافظ ابن حجر کی بخاری کی بڑی شرح کا مقدمہ ہے: ہدی الساری کے حوالہ سے ایک بڑی غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ یہ فتح الباری کا مقدمہ ہے، مگر یہ خیال صحیح نہیں۔ اس کی وضاحت خود حافظ ابن حجر کے قلم سے آ چکی ہے کہ یہ کتاب یا مقدمہ، صحیح بخاری کی اس بڑی شرح کے مقاصد کی تکمیل کے لیے لکھا گیا تھا، جس کی تصنیف کا انہوں نے فتح الباری کی تصنیف سے بہت پہلے ارادہ کیا تھا اور اس سے پہلے تغلیق التعلیق کا بہترین خلاصہ اور گویا عطر، اس مقدمہ میں لے لیا تھا، اس کے بعد مفصل شرح کی تحریر وتالیف پر متوجہ ہوئے تھے، مگر ابھی اس بڑے کام کا تھوڑا سا ہی حصہ وجود میں آیا تھا کہ حافظ کی رائے تبدیل ہوگئی اور انہوں نے فتح الباری کی شرح متوسط کا کام شروع کر دیا۔(۲۷)

حافظ نے شرح کبیر اور مقدمہ شرح کبیر صحیح بخاری دونوں کی ابتدا ۸۱۳ھ (۱۱-۱۴۱۰ھ) میں کی اور اسی سال ۸۱۳ھ میں وہ اس کی تحریر سے فارغ ہو گئے۔ لکھا کہ:

"فانی شرعت فی شرح البخاری، في سنة ثلاث عشرة وثمانمائة، بعد ان كنت خرجت باقية من الاحاديث المعلقة في كتاب، سميته تغليق التعليق، وكمل في سنة اربع وثمانمائة، ثم عملتُ مقدمة الشرح فكملتُ سنة ثلاث عشرة، المذكوره"۔

معلوم ہوا کہ یہ کتاب ہدی الساری فتح الباری کا مقدمہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک اور بڑی شرح صحیح بخاری کا مقدمہ ہے۔ جو ۸۱۳ھ میں شروع ہوا اور اسی سال پورا بھی ہو گیا۔

مقدمۂ صحیح بخاری کا صحیح نام کیا ہے: یہ مقدمہ شرح صحیح بخاری ھَدْیُ الساری کے نام سے مشہور ہے، اس کے تمام مطبوعہ اور اکثر قلمی نسخوں پر یہی نام ہے، اس کے باوجود اس کے اصل نام کی

تحقیق کی ضرورت پیش آئی۔

هُدَى السَّاري یا هَدْى السَّاري: عموماً ہُدی الساری اہل علم کی زبانوں پر جاری ہے، بعض نسخوں پر نام نہیں صرف مقدمہ تحریر ہے، ایک دو نسخوں پر الف لام کے اضافہ کے ساتھ الہدی الساری بھی ہے۔ ایک خطی نسخہ میں جو مصنف کی حیات میں ۳؍صفر ۸۵۲ھ کو مکمل ہوا تھا، اس پر ان کے قلم سے واضح لفظوں میں: هُدَى الساری (بضم الهاء و فتح الدال) لکھا ہوا ہے۔ (۲۸)

"هُدَى الساری، لمقدمة فتح الباری، للفقير احمد بن علی العسقلانی"

یہ نسخہ مکتبۃ الظاہریہ دمشق کے ذخیرہ میں ہے (۲۹)۔ یہاں یہ عرض کرنا نامناسب نہیں کہ ہُدی اور ہَدْی میں فرق اور فوقیت کے لیے صرف مذکورہ عبارت کو حتمی نہیں کہا جاسکتا، دوسری عبارتوں سے بھی اس کی تائید کی ضرورت ہے۔

الهدی الساری: کم سے کم ایک ہندوستانی نسخہ کی پیشانی پر الف لام کے اضافہ کے ساتھ "الهدي الساري" لکھا ہوا ہے، الف لام کا یہ اضافہ قدیم نسخوں میں نہیں ملتا، اس لیے اس کو غلطی پر اضافہ یا تحریف بھی کہا جاسکتا ہے۔

ہدی الساری کی تصنیف کے وقت سے مقبولیت: ہدی الساری کے نسخہ کی نقلیں لینے، مصنف کے سامنے پڑھنے اور اس کی اجازت وروایت کا سلسلہ شروع ہوا تو تیرہویں صدی ہجری تک جاری رہا۔ تیرہویں صدی کے شروع میں اول ہندوستان میں، اس کے برسوں بعد، مصر اور ترکی میں پریس آیا، اس وقت سے ہدی الساری چھپ کر عام ہونے لگی۔ اس دور میں بھی اول اول کتابوں کے نقل کا سلسلہ باقی تھا، مگر بعد میں بڑھتی طباعت کے ساتھ یہ معدوم ہوگیا۔

ہدی الساری کے اس تعارف میں اس کے نئے پرانے خطی اور مطبوعہ نسخوں کی تلخیصات، ترجموں اور اس کے مضامین کی منظوم کوششوں اور دوسری زبانوں میں اس کے ترجموں کا تذکرہ کیا جانا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

حواشی

(۱) حافظ کو ان سے جو تعلق تھا، اس کا اندازہ حافظ کی اس عبارت سے کیا جاسکتا ہے، لکھتے ہیں: "لازمته من سنة

تسعين إلى أن مات و كان يو دنى كثيراً، ويشهد لى فى۔ بالتقدم، ويتأدب معى إلى الغاية، مع مبالغتى فى تعظيمه، حتى كنت لا أسميه فى غيبته إلاّ إمام الأئمة'' انباء الغمر ۷/۲۴۲۔ (دائرۃ المعارف: حیدرآباد: ۱۳۹۴ھ۔۱۹۷۴ء) (۲) انباءالغمر ۷/۱۶۲۔ (۳) انباءالغمر بابناءالعمر ص:۲۳۹، ج:۵ (دائرۃالمعارف: حیدرآباد)۔ (۴) سخاوی نے لکھا ہے: ''سمع صاحب الترجمة منه فيها ما لا يحصىٰ'' الضوءاللامع ص:۳۸، ج:۵ انباءالغمر ص:۲۳۹۔ (۵) دکتورشاکرمحمودعبدالمنعم ص:۵۵۔ ج:۱۔ (۶) تغلیق التعلیق ص:۹۸ دکتورشاکرمحمود ص: ۸۳ ج ۱۔ (۷) دکتورشاکرمحمودعبدالمنعم ص:۶۶۔ (۸) تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: مقدمہ تغلیق التعلیق ص: ۱۲۰۔۱۱۸۔ اورشاکرمحمودعبدالمنعم، ص:۱۱۸، ج:۱۔ (۹) فہرس الفہارس ص:۳۳۷ ج:۲۔ (دارالغرب الاسلامی۔ بیروت: ۱۴۰۲ھ۔ ۱۹۸۲ء)۔ (۱۰) د: شاکرمحمودعبدالمنعم ص:۱۲۳، ج:۱۔ (۱۱) جامع الحسین شہید کربلا حضرت حسینؓ کی طرف منسوب ہے اور یہاں یہ بات مشہور ہے کہ ان کا سر مبارک یہاں مدفون ہے، یہاں ایک مزار ہے، جس پر ازدحام رہتا ہے، لیکن تاریخی طور پر یہ بات مستند نہیں، قرین قیاس یہی ہے کہ حضرت حسینؓ کا سر مبارک دمشق کی جامع اموی میں مدفون ہے، یہاں کے لوگ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ فاطمی حکمران اپنے عہد حکومت میں حضرت امام حسینؓ کا سر مبارک یہاں لے آئے تھے، لیکن مصر کے مستند مورخین جو فاطمی دور کے بہت بعد ہوئے ہیں، مثلاً علامہ سیوطیؒ اور علامہ مقریزیؒ وغیرہ ایسے کسی واقعے کا ذکر نہیں کرتے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت بہت بعد کی پیداوار ہے۔ (حاشیہ نگار، مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدّ فیوضہم)۔ (۱۲) ابن حجرالعسقلانی ودراسۃ مصنفاتہ۔ شاکرمحمودعبدالمنعم ص: ۱۲۳۔ (۱۳) جہان دیدہ (عالمی سفرنامہ) حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی (اردو ص: ۱۵۲، ۱۵۳۔ کراچی: اکتوبر ۱۹۸۹ء)۔ (۱۴) یہ معلومات دکتورشاکرمحمودعبدالمنعم کی اطلاعات پر مبنی ہیں مگر جناب سعید عبدالرحمن موسیٰ، القزفی نے مقدمہ تغلیق التعلیق میں (ج:۱، ص: ۱۸۳) حافظ کی تصنیف وتالیف کا آغاز ۷۹۶ھ میں قرار دیا ہے اور لکھا ہے:

''فكان ابتداءه فى التصنيف فى حدو دسنة ست و تسعين و سبع مائة''

لیکن نہ اس سن کے تعین کی وجہ لکھی، نہ ایسی کسی کتاب کا نام تحریر کیا، جو ۷۹۶ھ میں تالیف ہوئی ہو۔ استاذ سعید موسیٰ عبدالرحمن القزفی نے ایک اور موقع پر علوم لغت کے تحت، حافظ کی تصانیف کے تذکرہ میں، مقدمۃ العروض کا سنہ تالیف ۷۹۶ھ لکھا ہے، ص:۲۰۹، ج ۱۔ مگر اس سن میں حافظ کے یہاں تالیف وتحریر کی کسی خارجی یا داخلی ذریعہ سے تصدیق نہیں ہوئی۔ (۱۵) تغلیق التعلیق ص:۲۰۹، ج:۱، شاکرمحمودعبدالمنعم ص:۷۰ تا ۱۵۱/۳/۱۔ (۱۶) عنوان الزمان ۱/۹۶ بحوالہ مقدمہ تغلیق التعلیق ۱/۱۶۹۔ (۱۷) تفصیلات کے لیے دیکھیے: کتاب دکتورشاکرمحمدعبدالمنعم ص:

۱۶۷ تا ۱۷۲، ج:۱۔(۱۸)تغلیق التعلیق۔عبدالرحمن موسیٰ القزفی ۱/ ۲۱۵۔(۱۹)دکتور شاکر محمود ۱/ ۲۱۴۔(۲۰)ہدی الساری ص:۱۸۷، ادارۃ الطباعۃ المنیر یہ۔قاہرہ:مصر ۱۳۴۷ھ، نیز دیکھیے: شاکر محمود عبدالمنعم ۱/ ۲۱۵۔ (۲۱)نقل ورق اول انتقاض الاعتراض،ملحقہ ہدی الساری،مکتوبہ بقلم ابوالفتح ابراہیم۔ذی الحجہ ۱۱۸۴ھ(مارچ ۱۷۷۱ء)مکتبۃ الازہر قاہرہ مصر۔ (۲۲) الف:بستان المحدثین ص:۱۱۵ (مطبع مجتبائی دہلی:۱۳۳۳ھ)۔ ب: بستان المحدثین ص:۱۹۵ (مطبع گلزار محمدی ۔لاہور بلاسنہ)۔ ج: ترجمہ عربی بستان المحدثین ۔ ڈاکٹر محمد اکرم ندوی (دارالغرب الاسلامی، بیروت: ۲۰۰۲ء)۔ د: اردو ترجمہ، مع حواشی، بستان المحدثین۔ مرتبہ نورالحسن راشد کاندھلوی ص: ۳۳۱ (کاندھلہ ۲۰۱۶ء)۔(۲۳) د،شاکر محمود عبدالمنعم۔۱/ ۱۸۹۔(۲۴)الحافظ ابن حجر العسقلانی،امیر المومنین فی الحدیث عبدالستار شیخ۔ص:۴۳۰ (دارالقلم دمشق۔ ۱۴۱۲ھ۔ ۱۹۹۲ء)۔(۲۵) اتحاف القاری بمعرفۃ جھود واعمال العلماء، علی صحیح البخاری تالیف: محمد عصام عرار الحسینی ص:۳۷، (دارالیمامۃ للطباعۃ والنشر ۔ دمشق بیروت: ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء)۔(۲۶)۱/ ۱۸۶۔(۲۷) ہدی الساری ص:۴ مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیر یہ مصر ۱۳۴۷ھ۔(۲۸) مثلاً بروکلمان کی تاریخ الادب العربی کے مترجمین نے، فتح الباری کے تذکرہ کے بعد اس کے مقدمہ کے تعارف میں اس کا نام ہدایۃ الساری لکھ دیا ہے، ترجمہ تاریخ الادب العربی، بروکلمان ص: ۱۷۰، ج:۳۔ دکتور عبدالحلیم النجار (دارالمعارف القاہرہ: ۱۹۷۷ء)رضا لائبریری رام پور کی فہرست مخطوطات [Catalogue of the Arabic Manuscripts] میں بھی یہی غلطی ہوئی ہے۔ص ۱/ ۳۴۹،رامپور ۱۹۶۳ء۔(۲۹)انتقاض الاعتراض۔ورق اول۔ مشمولہ نسخہ خطی، فتح الباری مکتوبہ ۱۱۸۶ھ۔(مکتبۃ الازہر: دمشق) یہ نسخہ نیٹ پر موجود ہے۔انتقاض الاعتراض صمدی بن عبدالمجید السّلفی اور صبحی السامرائی کی تحقیق سے دوجلدوں میں (مکتبۃ الرشد: ریاض) سے شائع ہو چکی ہے مگر مرتبین کی صراحت کے مطابق، ان کے پیش نظر موجود، انتقاض الاعتراض کا خطی نسخہ اغلاط سے پُرتھا، محققین نسخہ نے لکھا ہے: ’’وجدنا بعض الأخطاء الاملائیۃ وغیر الاملائیۃ کثیراً ما وقعت في الخطوط فاصلناھا ص:۴،اس لیے راقم نورالحسن راشد نے قدیم خطی نسخہ سے عبارت نقل کی ہے۔(۳۰)اس اہم اطلاع کا جناب نواف بن محمد،عبدالرشید نے تعارف کرایا ہے۔ یہ مضمون کئی اداروں کی ویب سائٹ پر موجود ہے۔(۳۱) جواب مکتبۃ الاسد دمشق کا ایک حصہ ہے۔(تحریر جناب نواف بن محمد)۔

ہندو ایران
تہذیبی اور ادبی رشتے

پروفیسر شریف حسین قاسمی

ہند و ایران تعلقات کے مختلف پہلوؤں پر بہت زمانے سے برابر گفتگو ہوتی چلی آرہی ہے۔اس کی بنیادی وجہ ان دو ہمسایہ ملکوں میں برسہا برس قدیم اور متنوع جہات میں تعلقات حسنہ کی انفرادی نوعیت ہے۔جن دانشوروں نے اس میدان میں تحقیقی کام انجام دیے ہیں ان کا کہنا ہے کہ تاریخ ان تعلقات کی ابتدا کی نشان دہی نہیں کرسکتی۔جب بھی اور جو بھی ان روابط کے بارے میں آج گفتگو کرتا ہے،اس ضمن میں پنڈت جواہر لعل نہرو کا یہ قول ضرور نقل کرتا ہے اور میں بھی نقل کرنا چاہوں گا،اس لیے بھی کہ جواہر لعل نہرو جی کا یہ جملہ قدیم اور متواتر ہند۔ایران روابط کی ایک طویل تاریخ کے متلاطم سمندر کو ایک کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔پنڈت جی نے لکھا ہے:

> "Few people have been more closely related in origin and throughou history than the people of India and the people of Iran".

زبان، ادب، مذہب، ہنر اور تہذیب و تمدن کے گونا گوں میدانوں میں ہندوستان اور ایران نے ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھا اور ایک دوسرے کو سکھایا ہے۔اس لین دین کے سلسلے میں اہم بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ بہ طیب خاطر ہوا ہے،زور زبردستی کا اس میں کوئی دخل نہیں رہا۔یعنی ایرانیوں اور ہندوستانیوں دونوں نے ایک دوسرے کی روایات کو اپنا سمجھا،بیگانہ نہیں۔اسی لیے بلا کسی ردوکد کے اپنالیا۔

دہلی یونیورسٹی،دہلی۔

ادب اور تہذیب و تمدن ایک دوسرے سے جدا نہیں اور نہ الگ کیے جا سکتے ہیں۔اس وقت اسی نوعیت کے ہند۔ایران تعلقات پر گفتگو مقصود ہے، جو مبنی ہے ان مآخذ و مراجع پر جو آج اس فارسی زبان میں موجود ہیں، جن کی شدبد کا ہمیں دعویٰ ہے۔

فردوسی کا شاہنامہ پانچویں صدی ہجری کے اوائل میں نظم ہوا ہے۔فارسی کے اس رزمیہ شاہکار میں ہندایران تہذیبی اور ادبی روابط کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔فردوسی نے ظاہر ہے اپنے دور میں موجود مآخذ یا سینہ بہ سینہ چلی آرہی روایات کی بنیاد پر بتایا ہے کہ نوشیروان عادل نے اپنے دربار کے ایک دانش مند طبیب برزویہ کو ہندوستان بھیجا کہ وہ یہاں سے آب حیات ایران پہنچائے۔ برزویہ ہندوستان آیا اور یہاں اسے معلوم ہوا کہ جس زندگی جاوید کے وسیلے کی تلاش میں وہ یہاں بھیجا گیا ہے وہ سنسکرت میں پنچ تنتر کتاب کی صورت میں محفوظ ہے۔برزویہ نے سنسکرت سیکھی اور پنچ تنتر کا اپنی فارسی زبان پہلوی میں ترجمہ کیا۔اس ترجمے کے مفقود ہو جانے سے قبل ابن مقفع نے اس کا عربی میں ترجمہ کر لیا تھا۔اس عربی ترجمے سے پنچ تنتر کے فارسی کے علاوہ متعدد زبانوں میں تراجم کیے گئے اور اس طرح پنچ تنتر کا یہ پہلوی ترجمہ ہندوستان کی اس مایۂ ناز تصنیف کے مختلف زبانوں میں ترجمے اور متعارف ہونے کا ذریعہ قرار پایا۔پنچ تنتر غالباً وہ واحد ہندوستانی کتاب ہے جو ایران میں بہت مقبول ہوئی اور اس نے ایرانی ذہن کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ایرانی شعرا، سیاست دار اور حتیٰ کہ صوفیوں نے بھی اپنے اپنے مقاصد کے لیے اس سے ہمہ گیر قسم کا استفادہ اور عقائد و نظریات کی تائید و تصدیق کے لیے اس کتاب سے نقل و اقتباس کیا ہے۔فردوسی کے علاوہ، خاقانی، سنائی، عطار اور خود مولانا روم کی مثنوی میں پنچ تنتر اور جاتکا کہانیوں کے واضح اثرات نظر آتے ہیں۔مولانا روم نے تو ''طوطی و بازرگان'' حکایت میں یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اگر معرفت کی تلاش ہے تو اس کے ایک راستے کی کھوج ہندوستان میں کی جا سکتی ہے۔اس کے علاوہ نظام الملک طوسی نے اپنے سیاست نامہ میں بھی پنچ تنتر میں منقول ہندوستانی سیاسی و سماجی بالغ نظری سے فائدہ اٹھایا ہے۔اس کتاب کی جہان فارسی میں مقبولیت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ مختلف ادوار میں اس کے فارسی میں تراجم اور خلاصے کیے جاتے رہے یا دستیاب تراجم کو پھر سے بیان کیا جاتا رہا۔

فردوسی نے اپنے شاہنامہ میں ہندوستانی کھیل شطرنج کی جو تاریخ بیان کی گئی ہے وہ بھی

اپنی جگہ اہم اور انفرادی نوعیت کی حامل ہے۔ فردوسی کے بقول شطرنج بھی انوشیروان ہی کے دور میں ایران میں متعارف ہوئی۔ اس ہندوستانی کھیل کے بارے میں فردوسی نے جو تفصیل بیان کی ہے وہ خود ہمارے متعلقہ ماخذ میں نظر نہیں آتی۔ ایران میں اس کھیل کی عام مقبولیت میں آج تک کوئی فرق نہیں آیا۔ اسی دور میں ایرانیوں نے ہمیں اپنا کھیل نرد دیا۔

یہی وہ دور بھی ہے جب ایک ایرانی البیرونی ہندوستان آتا ہے۔ سندھ اور اس کے اطراف میں ہندوستانی علوم کی تعلیم حاصل کرتا ہے۔ یہاں کے مذاہب کا گہرا مطالعہ کرتا ہے۔ نجوم وغیرہ پر یہاں کی سنسکرت کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرتا ہے اور ہندوستانی اور بعض دیگر مذاہب پر اپنی معرکۃ الآرا کتاب تحقیق ماللہند میں روشنی ڈالتا ہے۔ یہ کتاب آج تک ہمارے مذاہب اور اس دور کے سماجی ماحول کی افہام وتفہیم کے لیے ایک معتبر ماخذ شمار ہوتی ہے۔ ہندوستان کو سمجھنے کی اس دور میں یہ ایک قابل قدر کوشش تھی جو خود ہمارے لیے بھی قابل استفادہ ہے۔

غزنویوں کی حکومت جب رو بہ زوال ہوئی اور خود ان کے پایہ تخت غزنیں اور ان کی وسیع و عریض قلم رو ایران وغیرہ میں زمین ان کے لیے تنگ ہوگئی تو محمود کے لڑکوں اور پوتوں کو پنجاب میں پناہ لینی پڑی جو ایک زمانہ سے غزنوی قلم رو کا ایک حصہ رہا تھا۔ لاہور ان کی بچی کھچی حکومت کی پناہ گاہ اور برصغیر میں فارسی زبان وادب کا سب سے قدیم اور اہم مرکز قرار پایا۔ لسانی اور ادبی حیثیت سے یہ دور نہایت اہمیت اور دوررس نتائج کا حامل ہے۔ اسی زمانے میں خراسانِ بزرگ اور ماوراء النہر کے علاقوں سے شعرا، ادبا، عرفا وغیرہ نے برصغیر کا رخ کیا۔ علم وادب و ہدایت کی بساط بچھائی، صلائے عام کا نعرہ بلند کیا۔ ان سب کی زبان فارسی تھی۔ عرفا نے اپنی اپنی خانقاہوں میں اسی زبان میں دینی امور کی تشریح وتوضیح کی جو گھر گھر پہنچی اور رفتہ رفتہ سارے ہندوستان کی علمی، ادبی اور پھر سرکاری زبان بن گئی اسی دور میں علی ہجویری معروف بہ داتا گنج بخش نے لاہور میں تصوف کی تعریف اور عرفا کے مختلف سلسلوں کی تعلیمات پر اپنی بنیادی کتاب کشف المحجوب لکھی جو بعد میں تصوف وعرفان پر لکھی جانے والی تقریباً تمام ہی کتابوں کا ایک ماخذ قرار پائی۔

یہی وہ دور بھی ہے جب برصغیر میں کم از کم دو بڑے فارسی شاعر مسعود سعد سلمان اور ابوالفرج فارسی شاعری کے افق پر نمودار ہوئے۔ مسعود سعد سلمان حبسیہ شاعری کا بنیاد گذار ہے۔

اسے حتّٰی قید خانے میں بھی ''نگار لاہور'' کی یاد تڑپاتی رہی:

رسید عید و من از روی حور و دلبر دور چگونہ باشم بی روی آن بہشتی حور

مرا کہ گوید کایدوست عید فرخ باد نگار من بہ لہا وور و من بہ نیشابور

ہندوستان میں جھلستی گرمیوں کے بعد برسات کا موسم بھی اس کے احساسات کے لیے نشاط آفرین تھا:

بر شگال ای بہار ہندوستان ای نجات از بلای تابستان

ہر سو از ابر لشکری دارید در امارت مگر سری دارید

سبز ہا را طراوتی دادی عمر ہا را حلاوتی دادی

مسعود سعد سلمان ہی کے بارے میں عوفی نے فارسی شعرا کے اپنے پہلے تذکرے لباب الالباب میں لکھا ہے کہ اس فارسی شاعر نے ہندوی میں بھی نہ صرف شاعری کی بلکہ اس زبان میں ایک دیوان بھی یادگار چھوڑا تھا جو اب مفقود الاثر ہے۔ خسرو دہلوی نے بھی اپنے ایک دیوان کے مقدمے میں اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ سب اس کا ثبوت ہے کہ فارسی اور ہندوستانی ادبی روایات میں اشتراک عمل شروع ہی سے صورت پذیر ہو گیا تھا۔ جو ہندوستان میں فارسی کے رواج میں مددگار ثابت ہوا۔

غزنویوں کے ہندوستان میں بار بار آنے کے زمانے سے ۱۸۵۷ء میں مغل سلطنت کے افسوس ناک خاتمے تک کوئی آٹھ صدیوں سے زیادہ عرصے تک فارسی ہمارے وسیع و عریض ملک میں سرکاری اور ادبی زبان رہی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ عام لوگوں کی زبان نہیں رہی، لیکن ہر طبقہ اس سے کسی نہ کسی طرح آشنا رہا جس کی وجہ سے ہماری بے شمار زبانوں حتی کہ لہجوں میں بھی فارسی زبان کے الفاظ نے گھر کر لیا اور آج تک اس صورت حال میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کشمیر سے کنیا کماری اور برما سے پاکستان میں فرنٹیر کے علاقے تک شاید ہی کوئی زبان ایسی ہو جس میں فارسی کے الفاظ بلا تامل مستعمل نہ ہوں۔ کشمیری، پنجابی، اردو، سندھی نے فارسی کے نسبتاً سب سے زیادہ الفاظ کو گلے لگایا ہے۔ فارسی زبان کے بے شمار الفاظ کا ہماری مختلف زبانوں میں داخل ہو جانا اور ان کا آج تک استعمال، فارسی تہذیب کی مقبولیت کی نشانی ہے۔ زبان ہی کیا، ہم نے فارسی ادب

کے سرچشمے سے بھی اپنی اپنی زبانوں کے ادب کو سیراب کیا ہے۔ کشمیری و بنگالی ادب دونوں فکر و ہیئت کے اعتبار سے فارسی ادب سے اثر پذیر ہوئے۔ غزل کی فارسی روایت کی تو آج تک دھوم ہے۔ متعدد ہندوستانی زبانوں میں غزل کہی جا رہی ہے۔ اردو، ہندی، گجراتی میں غزل کا بول بالا ہے۔ ہاں اس کے فکری عناصر میں ہم نے تنوع اور توسع سے کام لے کر اپنے نبوغ اور کاری گری کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ہم فارسی میں ایرانیوں کے شاگرد ہیں لیکن معمولی شاگرد نہیں۔ ہم نے ادب کے بعض میدانوں میں ایسے وقیع کام انجام دیے ہیں کہ خود اصل زبان ان کی اولیت، عظمت اور افادیت کے معترف ہیں۔ فارسی شعرا کے تذکرے، فرہنگیں، انشا پر کتابیں، سنسکرت اور دوسری ہندوستانی زبانوں سے فارسی میں تراجم، ادبی تنقید یہ وہ موضوعات ہیں جن پر ہندوستان میں فارسی دنیا کے مقابلے میں زیادہ کام کیا گیا ہے۔ مزید برآں یہاں شعرا نے جس اسلوب وطرز میں شاعری کی وہ خود امتیازی شان کی حامل ہے۔ فارسی شاعری پر علمی، تحقیقی اور ادبی کام کرنے والے حتیٰ کہ ایرانی دانشوروں نے بھی اس ہندوستانی اسلوب شاعری کو سراہا، خراج تحسین پیش کیا اور اسے ''سبک ہندی'' ہندوستانی اسلوب سے تعبیر کیا ہے۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ہم نے ایران کی ادبی روایات کو پورے طور پر اپنا لیا لیکن ہمارے نبوغ اور کاری گری نے ان روایات میں اضافہ کیا، ان میں جدت پیدا کی، ان کو وسعت دی، فکری اعتبار سے بھی اور ہیئت کے اعتبار سے بھی، جو فارسی ادب ہندوستان میں تخلیق ہوا، اس کی اپنی ہی شان ہے اور اس کی وجہ سے ہمارے جغرافیے، مذہبی اور تمدنی تنوع وغیرہ کے ادب پر نمایاں اثرات ہیں۔ لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، رستم سہراب کی داستانیں تقریباً ہر بڑی زبان میں بیان کی گئی ہیں۔ ان میں لیلیٰ مجنوں کے علاوہ دو دیگر ایرانی کہانیاں ہیں۔ یہاں اس امر کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ہندوستانی فارسی شعرا و ادبا نے داستان سرائی کے میدان میں بھی نمایاں کارگزاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ فردوسی کے شاہنامے اور نظامی گنجوی کے خمسے کی پیروی میں ہمارے شعرا نے بے شمار ہندوستانی کہانیاں نظم کی ہیں۔ اس نوعیت کے منظوم ادب کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں ہندوستانی ماحول، رسم ورواج وغیرہ کی عکاسی نظر آتی ہے۔ داستان سرائی میں ہندوستان کا یہ حصہ قابل قدر ہے اور فارسی کے منظوم ادب کی تاریخ میں اہم اضافہ بھی۔

ہندوستانی تصوف و عرفان بھی ایران کی دین ہے۔ اوائل سے آخر تک جن مشائخ نے ہندوستان میں اپنی خانقاہیں تعمیر کیں اور رشد و ہدایت کی شمعیں جلائیں وہ سب ہی یا ایران سے آئے یا ان کے خلفا ہیں اور یہ سب ہی فارسی زبان کے تھے۔ ان میں کوئی سجزی ہے، کوئی اوشی، کوئی ہمدانی ہے اور کوئی بخاری یا سمرقندی۔ ان سب نے اپنے اپنے سلسلے کے ان مشائخ کی کتابوں اور افکار و عقائد کا درس دیا جو ہندوستان نہیں آئے۔ ان میں ابوسعید ابوالخیر، قشیری، سنائی، عطار، رومی، شیخ شہاب الدین سہروردی، عبدالقادر جیلانی، جامی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہندوستانی خانقاہوں سے وابستہ بے شمار لوگ ان بیرونی مشائخ سے انجان نہیں تھے۔ اس کے نتیجے میں بھی ہندوستانی، ایران، خراسان اور مرکزی ایشیا سے روشناس ہوئے۔ اور اس کی وجہ سے ان علاقوں سے ہمارے رشتے استوار سے استوار تر ہوتے رہے۔

ان تمام مشائخ نے اپنے اپنے طور پر اسلامی تعلیمات کے ان پہلوؤں پر زیادہ زور دیا جن کا تعلق انسانوں کے آپسی تعلقات سے ہے۔ یہ مشائخ اپنی اپنی خانقاہوں میں اعلان کرتے رہے کہ:

ہر قوم راست راہی دینی و قبلہ گاہی

ہر قوم کا عبادت کا اپنا طریقہ ہے، اپنا دین ہے اور اپنا قبلہ

یا

ہر کہ دریں سرای بیاید، نانش بدہید و از ایمانش نپرسید

اس چوکھٹ پر جو بھی آئے، اس کو کھانا کھلاؤ، اس کے دین دھرم کے بارے میں پوچھ تاچھ نہ کرو

وہ اس ضمن میں یہ واقعہ بھی بیان کرتے رہے کہ:

حضرت ابراہیمؑ کبھی اکیلے کھانا نہیں کھاتے تھے۔ دسترخوان پر اگر کوئی مہمان نہ ہوتا تو اس کی تلاش میں گھر سے باہر نکل جاتے۔ ایک بار دسترخوان پر ایسا شخص موجود تھا جس کا دینی عقیدہ پیغمبر خدا کو پسند نہیں تھا۔ اس کے ساتھ کھانا کھانے میں انہیں تردد ہوا۔ خدا نے فوراً اپنے رب العالمین ہونے کا ثبوت دیا اور انہیں یاد دلایا کہ ابراہیم! ہم اسے سب سے قیمتی چیز جان دے سکتے ہیں، اور تمہیں اسے محض کھانا کھلانے میں تردد کیوں؟

بنی نوع انسان سے دوستی، محبت اور ہمدردانہ طور پر پیش آنے کے لیے یہ احکام نقارخانے

میں طوطی کی آواز نہیں تھے۔ان کی گونج سارے ہندوستان میں جہاں سماج طبقات میں بری طرح بٹا ہوا تھا، سنائی دی اور اس کی اثر اندامی کی بے شمار مثالیں معاصر اور بعد کی کتابوں میں مرقوم ہیں۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ بیشتر مشائخ اظہار احترام وغیرہ کے مراسم وطور وطریقوں میں ہندوستانی روایات سے سب سے زیادہ متاثر ہوتے۔ ہندوستان کے مختلف طبقوں میں صوفیہ اور تصوف کی مقبولیت و پسندیدگی کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

انسان دوستی اور اسی کے ساتھ عظمت انسانی کے اسلامی تصور نے ہمارے مفکروں، دانش مندوں، شعرا، درویشوں اور حتی کہ عام لوگوں کو بھی اپنی طرف متوجہ کیا اور بھگتی تحریک نے جنم لیا۔ رامانند، کبیر، دادو، رای داس اس تحریک کے راہنماؤں اور مبلغین میں شمار ہوتے ہیں۔ بھگتی تحریک کے زیر اثر جو ادب وجود میں آیا اس پر مشائخ کی تعلیمات اور فارسی زبان کے نمایاں اثرات نظر آتے ہیں۔

یہاں صوفی مشائخ کی خانقاہوں میں منعقد ہونے والی ان مجالس کا ذکر بے جا نہیں جہاں فارسی میں انسانیت کا درس دیا جاتا تھا اور جن میں ہر خاص وعام ذوق وشوق سے شرکت کرتا، فارسی سنتا اور متاثر ہوتا، ان بزرگوں، ان کے پیغام اور خود فارسی کے لیے ہمدردی کے جذبات لے کر ایک مجلس سے اگلی مجلس میں شرکت کے عزم کے ساتھ اٹھتا تھا۔

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ تہذیب وتمدن کے اساسی عناصر زبان، ادب، معماری، موسیقی، نقاشی، لباس، کھانا پینا ہیں۔ قرون وسطیٰ میں فارسی کا دور دورہ تھا، یہ محض ایک زبان نہیں، ایک کلچر کی نمایندہ بھی ہے۔ ایرانی، ترکی اور عربی تمدنی روایات اس کے عناصر ترکیبی ہیں۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ فارسی زبان کے ساتھ ساتھ ہمارے ملک میں یہی تمدنی عناصر کارفرما ہے۔

ہم زبان وادب کے بارے میں اجمالی گفتگو کر چکے۔ کچھ دیگر عناصر کی بات کرتے ہیں۔

ہند۔ایرانی معماری ایرانی اور ہندوستانی ندرت مند روایات کے امتزاج کی غالباً سب سے نمایاں مثال ہے۔ ہندوستان میں ترکوں کی حکومت کے قیام اور خاص طور پر مغلوں کے بر سر اقتدار آنے کے بعد، معماری پر تیموری اور ایرانی اثرات نے اس میدان میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ ہندوستانیوں کے ساتھ ایرانی ہنرمندوں، معماروں اور کاری گروں نے معماری میں جس ہنرمندانہ

تعاون کا مظاہر کیا، وہ آپ اپنی مثال اور ہندوستان کے گوشے گوشے میں توجہ کا مرکز ہے۔ اکبرو ہمایوں کے مقابر، تاج محل، دہلی کی جامع مسجد، لال قلعہ معماری میں ہند ایرانی روایات کے امتزاج کے بہترین اور دل آویز نمونے ہیں۔ ہند ایرانی معماری سے متعلق مختلف عناصر کی وضاحت کے لیے فارسی الفاظ کے متبادل ہندوستانی الفاظ غالباً موجود نہیں۔ خود یہ الفاظ اس نوعیت کی معماری پر فارسی کے گہرے اور انمٹ اثرات کی نشان دہی کرتے ہیں۔ قلعہ، فصیل، برج، کنگرہ، حرم سرا، غلام گردش، طاق، محراب، دیوان، دیوان خانہ، حویلی، غسل خانہ، بارہ دری، مینار، گنبد، روضہ، مقبرہ، دالان، نہر، حوض، فوارہ وغیرہ ایسے ہی فارسی الفاظ ہیں۔

معماری سے جڑی ہوئی ایک دوسری اہم چیز باغ ہے۔ مغلوں نے باغات لگانے میں بڑی دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کے لگائے ہوئے باغات اپنی طرح اور منصوبہ بندی میں ایرانی چار باغ کے دلکش نمونے ہیں۔ دلی، لاہور، کشمیر، پنجاب اور الٰہ آباد میں ان بادشاہوں نے بہترین باغات لگائے۔ ان میں بعض نئے پھولوں کے پودے اور پھلوں کے درخت ان کی دین ہیں۔

ہندوستانی موسیقی کی اپنی ایک قدیم اور وسیع دنیا ہے جس کا آج بھی اعتبار و احترام برقرار ہے۔ ہندوستانی موسیقی کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ جنوبی اور شمالی۔ جنوبی موسیقی خارجی عناصر و اثرات سے عام طور پر محفوظ رہی، لیکن شمالی موسیقی نے دیگر موسیقی روایات کو قبول کرنے کے لیے دروازے کھول دیے اور فارسی موسیقی کی بعض روایات کو اپنا لیا۔ ستار، طبلہ، نفیری، شہنائی کا ہمارے موسیقی کے نظام میں وجود، انھی بیرونی اثرات کی غمازی کرتے ہیں۔ اسی طرح خیال، قول، ترانہ وغیرہ ہندوستانی موسیقی کا حصہ اور فارسی و ہندی موسیقی دانوں کے درمیان نزدیکی لین دین کا مظہر ہیں۔

ہندوستان بھر میں لباس کا تنوع دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بڑی تعداد ہے ایسے فرقوں کی جو اپنے مخصوص لباس سے پہچانے جاتے ہیں۔ دور نہ جائیے، پنجابی اور کشمیری کو دیکھیے، پنجابی گیردار شلوار، لمبی ڈھیلی ڈھالی قمیض، کلاہ پر کلف دار، صافے اور اس پر طرے پر نازاں ہے۔ کشمیری کپکپا دینے والی سردی اور برفیلی ہوا سے نیرن سے اپنی حفاظت کرتا ہے۔ یہاں فارسی تہذیب نے پاجامہ کیا رائج کیا کہ ہم نے غرارہ اور چوڑی دار بھی سی لیے۔ دستی، رومال، موزہ، جوراب یہ سب خاص طور پر فارسی تہذیب کی دین ہیں۔

قرون وسطیٰ میں ہندو مسلم امرا کی حویلیاں فارسی طرز پر سجائی جاتی تھیں۔زنانہ اور مردانہ حصوں میں منقسم ان حویلیوں میں قالین، غالیچے،نمدہ،مسند،گاؤ تکیہ، پردہ، جھاڑ فانوس فارسی طور طریقوں کا نمونہ تھیں۔

بریانی، پلاؤ،خشکہ،قورمہ،کوفتہ، کباب، قیمہ،شیر مال، باقر خانی،تندوری، زردہ، فیرنی،حلوہ، نان وغیرہ ہمارے ہاں آج بھی عام کھانے ہیں۔ یہ سب فارسی تہذیب وتمدن کی دین ہیں۔ایسے کھانے ہر شخص نہیں پچا سکتا۔طبیعت انیس بیس ہوجاتی ہے توحکیم صاحب سے رجوع کیا جاتا ہے۔ وہ نسخہ لکھتے ہیں،عرق،خمیرہ،جلاب، جوشاندہ تجویز کرتے ہیں۔بیمار تندرست ہوکر غسل صحت کرتا ہے۔ نوکروں کوانعام دیتا ہے اور بیماری کے دور کا لباس مہتر کو بخش دیا جاتا ہے۔ یہ سب فارسی طور طریقے ہیں۔اس سے جڑے ہوئے الفاظ بھی فارسی ہیں اور آج تک ہمارے روزمرہ کام آتے ہیں۔

فارسی جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے،سرکاری زبان رہی ہے۔قرون وسطیٰ میں حکومت کے کام کاج اسی زبان میں انجام دیے جاتے رہے ہیں۔اسی کا نتیجہ ہے کہ آج بھی لوگ دیوانی وفوج داری مقدمات کے لیے عدالت جاتے ہیں۔مقدمہ بازی ہوتی ہے،وکیل کرتے ہیں،پیشی ہوتی ہے اور پھر منصف اپنا فیصلہ سناتا ہے۔ پولیس اور فوج میں بھی صورت حال یہی ہے۔ دیوان، داروغہ، حوالات، حولدار، رسالدار جمعدار اور صوبے دار وہ الفاظ ہیں جو ہماری پولیس اور فوج میں مختلف عہدے داروں کے لیے مستعمل ہیں۔فوجی آج بھی توپ، بندوق، بارود ہی استعمال کرتا ہے۔

آپ اگر دفتر میں کام کرتے ہیں تو صاحب سے واسطہ پڑتا ہے۔چھٹی کے لیے عرضی دینی پڑتی ہے۔ہم بازار جاتے ہیں تو بزاز کی دکان پر بھی کبھی جانا ہوتا ہے۔بساطی اور درزی سے بھی واسطہ پڑتا ہے اور پھر حلوائی تو ناگزیر ہے۔بیگم کے ساتھ کبھی کبھی صرافہ بھی جانا ہی ہوتا ہے،گلوبند، پازیب، زیور خریدے جاتے ہیں۔ یہ سب فارسی الفاظ اور اس کی تہذیب کے ہمارے ہاں مظاہر ہیں۔

مخطوطہ مخزن کائنات۔ایک تعارف

جناب سید حسن رضا عارف ہاشمی

راقم الحروف کو بہ زبان فارسی ایک صوفیانہ سوانحی طرز کی مثنوی کا قلمی نسخہ جوئیندہ یابندہ کی تقریب سے ہاتھ آیا ہے۔ یہ مثنوی بارہویں صدی ہجری کے آخر ربع ۱۱۷۹ھ کی ہے۔ جسے جونپور کے ایک صوفی شاعر نے نظم کیا ہے۔

آج بھی عربی فارسی کے نایاب مخطوطے وہاں سے دستیاب ہوجاتے ہیں، جہاں سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ وہ مسلم جن کے اسلاف صاحب علم واقتدار رہے۔ امتداد زمانہ کے ہاتھوں آج ان کے اخلاف عمومی صف میں آگئے ہیں یا انگریزی داں (ہندی داں) تجارت پیشہ ہوگئے ہیں، ان کی بے توجہی و ناواقفیت سے ایسے علمی خزانے بہت کچھ برباد ہوگئے اور ہوتے جارہے ہیں۔ ایسے قلمی نوادر کی جستجو ہونی چاہیے اور ان لوگوں کو بھی رضا کارانہ طور پر ان نسخوں کو موقر لائبریریوں کے سپرد کردینا چاہیے تاکہ زمانہ کی دست برد سے محفوظ ہوجائیں اور لائبریریوں کے قلمی خزانہ میں اضافہ ہو۔

فیزیکل ڈسکرپشن (۱): کتاب کا جائزہ کچھ یوں ہے۔ ایک سو چھیاسی صفحات، اوراق پریشان، خستہ و بوسیدہ حالت میں موجود ہیں۔ مبیضہ کا سائز ۸x۵ انچ ہے یعنی پوسٹ کارڈ سائز سے ذرا بڑا۔ ہر صفحہ پر ۱۷ سطریں ہیں اور ہر سطر میں ایک شعر، 3162=(17x186)، اس طرح تین ہزار سے زاید اشعار ہیں۔ رسم الخط نستعلیق، خوش خط، حروف موتی کی طرح نکھرے بکھرے ہوئے، روشنائی سیاہ پختہ اور پائیدار ہے، خوب پڑھے جاتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس زمانہ کی اور آج کی لکھاوٹ میں فرق آگیا ہے۔ جہاں جہاں نئے عنوانات قائم کیے گئے ہیں یا کوئی خصوصیت ظاہر کی گئی ہے، وہاں سرخ روشنائی استعمال کی گئی ہے۔ جو کچی تھی وہاں حروف نم آلود ہوکر اکثر پھیل گئے ہیں اور

محلہ سیتا رام، اعظم گڑھ۔

دوسرے صفحہ کو بھی داغدار کر دیا ہے، پڑھنے میں ذرا دقت ہوتی ہے۔

مبیضہ کا سرورق غائب ہے، جس پر کتاب، صاحب کتاب اور کبھی کاتب کا نام اور سن کتابت درج ہوتا ہے۔ کتاب کے شروع میں ایک کا ہندسہ رقم ہے، یعنی صفحہ اول، ۳، ۴ صفحات کے کونے پھٹے ہوئے ہیں، جس سے شعر ادھورا رہ گیا ہے، کوئی صفحہ سوائے سرورق کے ضائع نہیں ہے اور کتاب کے آخر میں کتنے صفحات ضائع ہیں، نہیں کہا جاسکتا، لیکن شاعر نے مثنوی کے صفحہ ۱۷۵ پر ایک عنوان قائم کیا ہے۔

''آخر کتاب'' جس کے ۱۰ صفحات موجود ہیں نہیں کہا جاسکتا، ادھر کتنے صفحات ضائع ہیں لیکن قیاس ہے کم صفحات ہی ضائع ہوئے ہوں گے۔

مثنوی کا معنوی جائزہ: یہ کتاب صوفیانہ، سوانحی طرز کی مثنوی ہے، جس میں نعت رسولؐ، مدح صحابہؓ و خلفائے راشدین، منقبت ائمہ اہل بیتؑ، ائمہ جمہور اسلام، امام اعظم اور ان کے شاگرد ابومحمد و ابویوسف، امام مالک و شافعی (حنبل کا ذکر نہیں ہے) اور مخصوص صحابہ و تابعین اور محدثین میں امام بخاری و صحیح مسلم کا ذکر ہے۔

اس کے بعد ہند و بیرون ہند کے مشائخ عظام، صوفیائے کرام، علما و مفکرین اسلام اور فاتحین کا بھی ذکر ہے مثلاً امیر تیمور، محمود غزنوی، بہرائچ والے مسعود غازی شہید کا ذکر ہے۔ یوں ۱۹۵ نام ہیں جو مثنوی کے مختصر صفحات میں ص ۶۹ سے ص ۱۲۸ تک آگئے ہیں۔

چونکہ صاحب مثنوی جونپور کے باشندہ تھے، انہیں ذہنی ہم آہنگی و قلبی تعلق جونپور سے ہے۔ اس بنا پر انہوں نے الگ سے ایک عنوان قائم کر کے جونپور کے آباد ہونے اور اس کے مشائخ و صوفیہ کا ذکر ص ۱۲۹ سے ص ۱۷۵ تک کیا ہے، جس سے محققین کو مدد مل سکتی ہے۔ ص ۱۷۵ سے ۱۸۶ تک شاعر کے دور کے لوگوں کا ذکر ہے، شاعر نے اپنے شجرہ اور حالات کا بھی ذکر کیا ہے۔ مبیضہ کے محدود صفحات میں اس قدر نام آنے سے یہ کتاب کتاب فہرست بن کر رہ گئی ہے۔

مثنوی کی زبان عام فہم، مثل گلستان و بوستان ہے لیکن شاعر کو دیگر اصناف سخن پر بھی قدرت حاصل ہے، جابجا مناجات، قصیدہ اور قطعات ہیں۔ مضامین کے اعتبار سے اس مبیضہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

پہلے حصہ میں نعت، مدح صحابہ، منقبت آل رسول اور ائمہ جمہور و محدثین کا ذکر ہے۔ دوسرے حصہ میں مشائخ اسلام کے (ہند و بیرون ہند کے نام) آئے ہیں اور تیسرے حصے میں جونپور کے مشائخ کا مخصوص طور پر ذکر ہے، جو کتاب کے حصہ ۱۲۸ سے خاتمہ کتاب تک دراز ہے۔ خاتمہ کتاب کے عنوان میں صوفی صاحب نے اپنا شجرہ بیان کیا ہے۔ بلبن کے زمانہ میں موصوف کے اجداد خراسان سے دہلی اور وہاں سے شاہان شرقیہ کے زمانے میں وارد جونپور ہوئے تھے۔

مثنوی کی ایک خوبی یہ ہے کہ جو بھی نام آیا ہے۔ اس کی ولادت و وفات کا تاریخی مادہ نکالا گیا ہے۔ تاریخی مادہ نکالنے میں شاعر کو یہ دسترس حاصل ہے کہ ایک ہی مصرعہ میں دو دو بار تاریخی مادہ نکالتے ہیں اور کہیں کہیں اپنے ممدوح کا نام ہی تاریخی مادہ بنا دیتے ہیں۔ (ذکر آگے آتا ہے)

کتاب کا تاریخی مادہ نکالنے کے سلسلہ میں مثنوی کا نام مخزن کائنات (۱۱۷۹ھ) معلوم ہوا۔ شاعر کا نام احسن اللہ بطور تخلص بیسیوں بار آیا ہے۔ کتاب کے ص ۲ پر ایک عنوان ہے ''سبب تالیف کتاب'' جس کے چار صفحات پر محیط ۱۶۸ اشعار ہیں۔ یہ معلوماتی اور قیمتی ہیں۔ یعنی یہ مثنوی کس ہجری میں لکھی گئی؟ کتنے عرصہ میں لکھی گئی؟ موضوع کیا ہے؟ شاعر نے عہد جوانی کیسے کاٹا اور جب بزم عیش و عشرت بکھر گئی، بال بچوں کے گزر جانے سے دل کی دنیا اجڑ گئی تو شاعر نے اس کتاب کو توشۂ آخرت بنا لیا۔

جائے فرزند ایں کتاب مرا ۔۔۔ یہ شود شافع عذاب مرا

عنفوان شباب پر شاعر کی سیاہ راتیں، بادہ پرستی و مشاہدۂ حسن و شباب کی نذر ہوئی تھیں لیکن صبح صادق حق پرستی سے روز روشن کرتے تھے۔ شاعر کی زبانی سنیے

عنفوان شباب مستی بود ۔۔۔ غفلت از راہ حق پرستی بود
دست و قلب و زبان، نگاہ ہمہ ۔۔۔ اک جہان کاست گناہ ہمہ
گرچہ کسب گناہ می کردم ۔۔۔ ہم بہ طاعت نگاہ ہم کردم
شب چراغ گناہ روشن کرد ۔۔۔ از گل خیر روز روشن کرد
ہم بہ ورد تلاوت قرآن ۔۔۔ داشتم شغل اندراں عصیان

چونکہ شاعر کے دل میں خیر کی رمق باقی تھی۔ اعتراف تھا ''گناہ می کردم'' اس لیے جب نیرنگئ روزگار سے ادبار کا زمانہ آیا تو شاعر نے اسے عذاب خداوندی جانا۔ بیوی بچے سب رخصت

ہوئے، سب کچھ لٹا کے ہوش آیا تو اپنے آپ کو دینی کتابوں کے مطالعہ میں غرق کر دیا۔

روز و شب دیدن احوال شد چوں از فضل ایزد متعال
شغل مذکور چوں اثر کردہ در دل من چنیں گزر کردہ
انچہ در سینۂ بود مکتوم جلوہ گرد شد بصورت مرقوم

اس مثنوی کا موضوع کیا ہے، ان تین اشعار میں یوں وضاحت کی ہے:

کہ بہ من حضرت رسول کریمؐ و ز صحابہ و اہل بیت عظیم
و ز ہمہ اولیا کہ مشہور اند از عبرت تا بہ ہند منظور اند
دیگر از عمدگان ہند زمین خاص(۲) یاران بندہ مسکین

اس مثنوی کی منفرد اور خاص خوبی اس کا تاریخی مادہ ہے، جس کا شاعر کو بھی احساس ہے۔ اتنے سارے نام جن کی تعداد مجموعی طور پر ڈھائی سو سے زیادہ ہے۔ ولادت و وفات، خاص خاص واقعات کا تاریخی مادہ نکالنا بہت بڑی بات ہے۔ بات بات پر تاریخی مادہ ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔ کہتے ہیں ؎

سال مولود و سال رحلت و ماہ در قلم آورم بلا اشباہ
اختلاف روات بگزارم روئے خود سوئے ماتفق آرم

سن تصنیف اور تاریخی نام: یہ مثنوی ۱۱۷۹ھ میں لکھی گئی۔ شاعر نے ۱۱۷۹ھ کا تاریخی مادہ مخزن کائنات سے نکالا ہے۔ سن ہجری لکھنا جو انگریزی عہد میں تکلفاً اور اب ہندی زمانے میں عموماً ناپید ہے۔ وہ شعر یوں ہے ؎

مخزن کائنات نامش خواں سال تالیف ہم زمانش داں
۱ ۱ ۷ ۹

شاعر کی زود گوئی استعجاب میں ڈال دیتی ہے، شاعر نے مثنوی مخزن کائنات ڈھائی ماہ میں تیار کر لی تھی۔ تین ہزار سے اوپر اشعار ہیں۔ خود فخریہ کہتے ہیں ؎

درمیان دو ماہ و چند ایام از رجب تا بہ نصف ماہ صیام

مضمون کے اعتبار سے تاریخی مادہ نکالنا اور شخصیت کے رتبہ کا خیال رکھنا یہ معمولی بات نہیں، اب تو لوگ ابجد، ہوز، حطی سے گھبراتے ہیں۔

مثنوی کے صفحہ اول کا مضمون تبرکاً وثواباً یوں ہے۔ دو دو شعر نکالے ہیں۔ عنوان ہے "خلفاء اربعہ، عشرہ مبشرہ اور اصحاب صفہ"۔

افضل الناس بعد پیغمبر (کونہ پھٹا ہوا ہے)
ہست ابو بکر حضرت صدیق (کونہ پھٹا ہوا ہے)
بعد او حضرت عمر باشد ملک عدل با قمر باشد
رائے او حسب وحی حق بودہ بہ زبان غیر حق نہ فرمودہ
بعد او بودہ حضرت عثمان صاحب شرم قبلہ الاخوان
ذات او بودہ جامع القرآن مورد الحیا من الایمان
مرتضی بعد اوست شاہ سوار ہم چوں قران پس از آمد چار

(یعنی تورات، زبور، انجیل کے بعد قرآن نازل ہوا ہے)

او خلافت ز مصطفی دارد فیض باطن ہم از خدا دارد

اس کے بعد حضرت سعد بن وقاص، ابوعبیدہ، سعد بن عبدالرحمان، طلحہ بن زبیر رضوان علیہم یعنی عشرہ مبشرہ کی شان میں اشعار ہیں۔ (خلفائے راشدہ ۴+۶=۱۰)

ایں ہمہ عشرہ مبشرہ را کہ بہشتی بود قطعی ابدا

مثنوی کے صفحہ ۴ پر تالیف کتاب کا عنوان از حد معلوماتی ہے، جس کا ذکر ہو چکا۔ ہدیتاً وتبرکاً اشعار کے بعد صوفی صاحب نے اپنے پیر کا ذکر کیا ہے اور حق پیری پر زور وشور طور سے ادا کیا ہے۔ بہت زیادہ مدحیہ اشعار ان کی شان میں نکالے ہیں۔

شاعر غالباً اس دور آزمائش و ابتلا میں جب بیوی بچوں کے گزر جانے کا صدمہ عظیم پہنچا ہے۔ حضرت غلام رشید قدس سرہ کے دست مبارک پر بیعت کر لیتا ہے ؎

کہ بہ صد آرزو مرید شدم بندہ ثانیٔ رشید شدم

"پیر دست گیر حضرت غلام رشید" کا عنوان قائم کر کے غالباً ۵۰ سے اوپر اشعار نکالے ہیں۔ اپنے پیر صاحب کی امتیازی شان یہ بیان کی ہے کہ صوفیوں اور مشائخ کے روایتی لباس سے ان کو اجتناب تھا۔

نہ لباس مشائخانہ بود　　دوسرا مصرعہ دیمک چاٹ گئی ہے

وضع او چوں سپاہیانہ کہ بود　　قول او چونکہ عارفانہ کہ بود

کہ سے زور پیدا کیا ہے۔

بھلا صوفی صاحب اپنے پیر کا سن ولادت و وفات کیوں نہ نکالتے ؎

سال میلاد گفت بے شک و ریب　　اجود نیک بخت ہاتف گفت

مولد ۱۰۹۶ھ

اور وفات کا تاریخی مادہ یوں ہے ؎

ہاتف غیب گفت تاریخش　　مہدی امت رسول خدا

ف ۱۱۶۷ھ

نوٹ: ردیف الگ ہوگئی؟ یہ کاتب کی غلطی ہوگی۔

حضرت غلام رشید کے تذکرہ کے لیے مولانا حبیب الرحمان کی کتاب "اعظم گڑھ کے علما و صوفیہ" پڑھیے۔ موصوف دیوگام کے تھے۔ حضرت غلام رشید کا مدفن شہر پورنیہ (اڑیسہ) ہے ؎

او میان پورنیہ اک چند　　روضۂ جد خویش کردہ پسند

حضرت غلام رشید کے جدامجد بھی اڑیسہ کے گھور کفرستان میں علم و آگہی و محبت سے اسلام کی تبلیغ کررہے تھے۔ مرحبا صد آفرین ہمارے صوفیائے کرام، جن کی جولان گاہ وہاں تک تھی۔

پیر خود کے عنوان کے بعد صوفی صاحب کی نظر انتخاب میں ۷،۸ مشائخ آئے ہیں، جن کے اسمائے گرامی لکھنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ۱۔ حضرت شمشاد علوی، ۲۔ حضرت خواجہ بیر کفر قدس سرہ، ۳۔ حضرت خواجہ حذیفہ عرشی قدس سرہ، ۴۔ حضرت خواجہ ابراہیم ادھم، ۵۔ حضرت خواجہ (؟)، ۶۔ فضیل عباس قدس سرہ، ۷۔ حضرت عبدالواحد، ۸۔ خواجہ حسن بصری رضوان اللہ علیہم۔ عموماً ان سارے صوفیائے کرام کا سن ولادت و وفات شان عظمت میں ۴،۱۵ اشعار کہے گئے ہیں۔ خواجہ ادھم کا بیان ذرا تفصیلی گیارہ اشعار میں ہے۔

چونکہ صوفیائے کرام حضرت علیؓ کو اقلیم روحانیت کا شاہنشاہ مانتے ہیں اور بہت سے مشائخ کا رشتۂ نسب و ارادت اس ذات اقدس پر ختم ہوتا ہے۔ ہمارے صوفی صاحب احسن اللہ علوی کا

سلسلۂ نسب حضرت علیؓ کی ذات بابرکات تک جاتا ہے۔ ارادت وعقیدت میں وہ کچھ کہہ جاتے ہیں۔ جو صرف صوفیائے کرام کو زیب دیتا ہے۔صوفی صاحب عنوان باندھتے ہیں:

"پیر پیران جہان شاہ مردان علی علیہ السلام" ؎

مرتضیٰ ہم چوں مصطفیٰ باشد   کہ بہ دین حاجت کہ او باشد
نائب مصطفیٰ علی ولی است   صاحب مصطفیٰ علی ولی است
صد ہزار اولیا مریدی اند   اہل عرفان ہم از مریدی اند
سال ثقلش بہ قطعہ مرقوم   ...... ازخلق شد نہاں مخدوم

ف ۴۰ھ ف ۴۰ھ ف ۴۰ھ

اور ایک طویل منقبت (قصیدہ) ہے، جو طوالت کے خیال سے ترک کیا جاتا ہے۔ ۴۰ اشعار نظم فرماتے ہیں، منقبت کے دو شعر جو مستند و معتبر و متفق ہیں، تاریخ اور حدیث ہیں۔ جس میں خم غدیر و رسول اللہؐ کے مختصر خطبہ کا ذکر آیا ہے اور رسول اللہؐ نے خطبہ میں فرمایا تھا:

"من کنت مولاہ فعلی مولاہ"۔ جس کا میں مولا ہوں علی اس کا مولا ہے۔

رسول اللہؐ کی زبانی صوفی صاحب فرماتے ہیں

بہ گفتار ہر کرا ہاشیم مولا   بود مولا علی بے شبہ او را
مبارک باد بدر بر غدیرش   رسید از خلق حیدر شد آمیرش

اہل لغات نے بہت سے معنی مولا کے بیان کیے ہیں۔ کچھ معنی اس زمانے میں غلام کے مستعمل بھی رہے ہیں۔ پھلواری شریف کے ایک صوفی صاحب کا یہ شعر کتنا پر لطف ہے۔ فرماتے ہیں:

چرا در معنی من کنت مولا می روی ہرسو
علی مولا بہ این معنی کہ پیغمبر بود مولا

صوفی احسن اللہ علوی نے مخزن کائنات میں حمد باری تعالیٰ سے کیوں شروع نہیں کیا؟ کیا کوئی صفحہ تھا جو ضائع ہو گیا ہو۔ نعتیہ اشعار بھی مثنوی کے صفحہ ۳۲ پر آئے ہیں اور اس کے بعد خلفائے راشدین کی مدح میں اشعار نظم فرماتے ہیں۔ رسول اللہؐ کا عنوان ہے:

"خاتم الانبیا حضرت احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

مصطفیٰ مالک زمین و زمان خاتم الانبیا شہ عرفان
کہ حبیب خدائے عالم خود بہر او شد زمین زمان موجود
شاہ دو کون بود فخر و را دل فقیر و معیشت فقرا
سرور جملہ انبیائے کرام مالک کل اولیائے عظام
پدر مہربان امت بود شافع جرم روز خجلت بود

اس کے بعد بہت سارے اشعار مناجات اور اپنے جرم پر خجل ہونے اور رسول خدا سے التماس دعا کے ہے۔ اردو ادب میں حالی کی دعا ''اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے۔ امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے۔ اور فارسی میں ملا جامی کی دعا بہت زوردار ہے زمہجوری برآمد جان عالم ترحم یا نبی اللہ ترحم صوفی احسن اللہ کی مناجات ایسی زوردار تو نہیں ہے۔ لیکن صدق دل سے نکلی ہوئی دعا پر اثر ہے جو عزت و آبرو، دین و ایمان ضعیفی کے بوجھل مہ و سال بخیریت گزر جانے کے لیے مانگی گئی ہے۔ صوفی صاحب دست وہ دعا ہیں ؎

رحمت عالمی شفیع گناہ رحم لازم ترا بہ حال تباہ

مدح صحابہ: نعتیہ کلام، دعا اور مناجات کے بعد خلفائے راشدین کی مدح میں دوبارہ مفصل اشعار ہیں۔ مثنوی کے شروع میں جو اشعار کہے تھے وہ تبرکاً تھے۔ خلیفہ اول رضی اللہ عنہ

یار غار نبی ابو بکر است صاحب صدق را و معتبر است
جان و تن مال جملہ و دختر کرد بر مصطفیٰ نثار نگر
مثل او در صحابہ کس نہ بود یار عنقا ببیں مگس نہ بود

رحلت تاریخی مادہ یوں ہے:

عمر او بود شصت و سہ سالہ گزرش شد گرفتہ در ہالہ
کرد ہاتف ز سال وصل خطاب کہ ہما رفتہ از جہان در باب

اس مصرع میں دوبار تاریخ وفات کا مادہ حسب مرتبت ہما (۱۲) اور جہان (۱۳) سے نکالا ہے شاید کاتب نے جہان در باب جہان خراب کے بدلہ لکھ دیا ہے۔

خلیفہ ثانی رضی اللہ عنہ عنوان ہے، چار اشعار ملاحظہ فرمائیں:

صاحب عدل حضرت عمر است　　که ز نخل عدالت او ثمر است

گفت پیغمبر از رہ الطاف　　وصف ان شاہ انصاف

یہ زوردار شعر ہے

کہ گریزد زہیبتش ابلیس　　کہ شود عیش رفت آزو تلبیس

سال ثقلش بہ کن زخامہ نگاہ نہ بود کس بہ عدل چوں آن شاہ (ف ۲۳ ہجری)

خلیفہ سویم رضی اللہ عنہ

آں کہ اہل دو نور عثمان است　　قالب دین را دل و جان است

در جہان خاتم المروت بود　　صاحب ہمت اہل الفت بود

بود ہشتاد و ہشت یا کہ دو سال　　مدت عمر آں شہ فضال

سال وصلش بہ گفت ایں غمگین　　شدہ اوج حیا برون از دین

ف ۳۵ھ　　۳۵ھ

ایک مصرعہ میں دوبار تاریخ وفات کا مادہ نکالا گیا۔ رتبہ اور فضیلت کا خاص خیال رکھا گیا۔

چونکہ صوفیائے کرام حضرت علی کرم اللہ وجہ کو تاجدار مملکت روحانیت جانتے ہیں۔ احسن اللہ اپنے پیشوا کی شان میں ''پیر خود'' کے بعد پیران جہان کے عنوان سے کافی اشعار کہہ چکے تھے۔ اس لیے خلیفہ چہارم کا عنوان نہیں قائم کیا ہے۔

مخزن کائنات کے صفحہ ۳۲ سے ۴۰ تک یعنی ۸ صفحات میں بہت اختصار کے ساتھ اپنے مخصوص ومنتخب صحابہ کرام کا ذکر دو تین اشعار میں کیا ہے۔ اس میں کوئی خاص بات سوائے تاریخی مادہ کے نظر نہیں آتی۔

صفحہ ۴۰ سے ۶۳ تک یعنی ۲۴ صفحات پر خانوادہ رسول اکرمؐ، حضرات حسنین، خاتون جنت حضرت فاطمہ زہرا کی بارگاہ میں عقیدت کے اشعار ہیں۔ منقبت کے ساتھ ایک معجزہ ضرور بیان کیا ہے۔ معجزہ کو صوفی صاحب ''حکایت'' کا عنوان دیتے ہیں، کشف وکرامات کی بھرمار ہے۔ جو ہر امام کے ساتھ ہے۔

کچھ اشعار پیش ہیں:

ہست بعد از علی امام زمن نور چشم نبی امام حسن
بعد او بود ہادی کونین نور چشم نبی امام حسین
صفت حضرت حسین و حسن ہم چوں خورشید و مہ بہ او روشن
جگر و جان مصطفیٰ بودند دین و ایمان مرتضیٰ بودند

خاتون جنت حضرت محمد مصطفیؐ کی چہیتی بیٹی ہیں، جن کے طفیل میں اللہ نے حضرات حسنین جیسے بیٹے عطا فرمائے۔ حضرت علی شجاع و جری کرار غیر فرار شوہر ہیں۔ بیویوں کو اپنے بہادر شوہر پر بڑا ناز ہوتا ہے۔ شاعر نے عفت و عصمت کو مجسمہ قرار دے کر خدمت گزاری و عصمت سرا پر جھاڑ و لگانے پر مقرر کر دیا ہے۔ علامہ اقبال جیسے دانشور شاعر کی نگاہ اس نکتہ پر گئی ہے ؎

حضرت مریم ز یک نسبت عزیز از سہ نسبت حضرت زہرا عزیز

منقبت کے بعد بارگاہ خاتون جنت میں بہت لمبی الحاح وزاری ہے۔ بارگاہ باری تعالیٰ میں توبہ و استغفار ہے۔ یہ مناجات ۱۴۹ اشعار کی ہے۔ عربی میں بھی اکثر اشعار ہیں۔ جس سے شاعر کی عربی دانی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ تن من دھن کی حفاظت، فراغت روزی، ایمان کی سلامتی، آفات سے امان، معاصی سے توبہ، شیطان رجیم سے تعوذ، فضل و منزلت کی آرزو، غرض ہر شعر میں ایک بات ہے۔

رب یا ذوالجلال و الاکرام بالحسین الہدی علیہ السلام
قوت تن فراغت روزی بعد ایمان ثابت الاسلام
احسن اللہ رزقنا ابدا مع عیش موافق الایام

صوفی صاحب کی مناجات کی ردیف میمہ ہے۔ مرزا غالب نے ایک قصیدہ بہادر شاہ ظفر کی مدح میں کہا تھا، جس کی زمین اور ردیف میمہ ہے۔ اس مشہور قصیدہ کا پہلا شعر یوں ہے ؎

ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

کیا یہ مناجات مرزا غالب کی نظر سے گزری تھی؟ تحقیق طلب ہے۔

چونکہ حضرات حسنین رضوان اللہ علیہم کی مدح میں چند اشعار کہنے سے صوفی صاحب کی سیری نہیں ہوئی۔ دوبارہ الگ الگ عنوان باندھا ہے۔ تاریخ ولادت و شہادت بیان کی ہے۔ تاریخی مادہ نکالا ہے۔ حضرت امام حسن کے لیے شاعر نے یہ عنوان باندھا ہے۔

تولد ورحلت حضرت امام حسن علیہ السلام،تولد کی تاریخ جنت سے اور رحلت کی آہ داداز جہان فرمود سے نکالی ہے۔حضرت امام حسین کے تولد وشہادت کی سرخی ہے۔تاریخ تولد ورحلت امام حسین علیہ السلام

گفت ہاتف سر جلیل بود یا کہ گوید سر دلیل بود

ولادت ۳ھ پ ۴ھ

اورشہادت کے لیے

از محرم دھم روز جمعہ کہ بود بہر امت فدائی سر فرمود

ش ۱۴ھ

دوبارہ تاریخ رحلت نکالتے ہیں

سال ان رحلت امام امم رفت امید گاہ از عالم

۶۱ھ ۶۱ھ

حضرات حسنین کے بعد امام حسین کے فرزند علی بن الحسین کا ذکر ہے جنہیں کثرت عبادت سے زین العابدین کہا جاتا تھا اور نام سے زیادہ لقب مشہور ہے۔

ان امام ہمام زین عباد قطب ابدال و مرشد و اوتاد
وارث دین مصطفیٰ بودہ مالک علم مرتضیٰ بودہ
ہر کما ے کہ بود در حسنین بود او چوں نور عینین
طبع من سال فصل ان کردم گفت بیرون ہما شد از عالم

صوفی احسن اللہ علوی شیعوں کے امام اثنا عشرہ حضرت محمد بن حسن العسکری کی نسبت اثنا عشری شیعوں جیسا عقیدہ رکھتے ہیں۔اس شعر میں اشارہ کیا ہے:

مذہب سنی ار چہ نیست چنین کہ بود زندہ ان امام مبین

لیکن صوفی صاحب کا عقیدہ ہے:

لیک شد اعتقاد این بندہ کہ بود ہم چوں خضر یا بندہ

اور اپنے اعتقاد میں دلیل پر دلیل دیتے چلے گئے ہیں۔

ایک جملہ معترضہ: خانوادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خصوصاً ائمہ اہل بیت سے گروہ صوفیہ (اصفیا) کی بڑھی ہوئی عقیدت دیکھ کر بعض ناقدین صوفی ازم، اس طرف گئے ہیں کہ یہ حالت تقیہ میں شیعہ تھے لیکن بات یہ نہیں ہے۔ ان کا مسلک اخوت ومحبت بین المسلمین تھا۔ خلفائے بنی عباسیہ نے جو مذہبی مباحثہ ومناظرہ سے ایک ماحول پیدا کر دیا تھا۔ اسی کا تریاق یہ مسلک تھا امام غزالی کے اوراق زندگی الٹ جائیں۔ مولانا روم کے حالات پڑھ جائیں، جنھوں نے مناظرہ سے برأت کر لی تھی۔ مولانا روم ہر فرقہ کو یکساں احترام دیتے تھے۔ دراصل اس فرقہ کا پیغام محبت تھا۔ دلوں کو جوڑنے میں یقین رکھتے تھے۔

دوسری طرف صوفیائے کرام نے فروغ اسلام کے لیے جو بساط بچھائی تھی۔ اسی مسند رشد و ہدایت کے رہبر و مشعل راہ ائمہ اہل بیت تھے۔ ان کا رشتہ ارادت وروحانیت خانوادۂ رسول پاکؐ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ جاملتا ہے۔

ذکر ائمہ اہل بیت علیہ السلام کے بعد ائمہ جمہور اسلام جن سے مسالک اربعہ ہیں۔ انہیں زیر قلم لائے ہیں (امام حنبل کو نظر انداز کر دیا ہے) سب سے زیادہ امام اعظم حضرت نعمان بن ثابت کی شان میں اشعار کہے ہیں۔ مدح کے بعد وہی طریقہ مادہ تاریخی کا ہے۔ سرخی قائم کی ہے "امام اعظم ابوحنیفہؓ"۔

بو حنیفہ کہ اجتہاد بود دوست دار نبی و آل بود
در جناب امام دین صادق کردہ دو سال خدمت لائق

تطویل کے خیال سے مدحیہ کلام چھوڑا جاتا ہے۔

سال میلاد را نوشت چنین مظہر الحق کہ بود اہل یقین
سال میلاد ان شہ والا سر فقہا است یا سر علما
پ۰ ۷ھ پ۵ ۷ھ
سال ثقار آن شہ اعظم اوج علم آمدہ بقید قلم
ف۱۵۰ھ

اور دونوں شاگردوں کے لیے ایک سرخی قائم کی ہے "ابو محمد وابو یوسف رضی اللہ عنہم"۔

از تلامیذ او محمد نام ہم ابو یوسف ان بہ علم تمام
یعنی شرع و قاضیٔ اسلام اجتہادش جہان گرفت تمام

مدح، تاریخ میلاد وارتحال ملا کر دس اشعار ہیں اور انہیں سے صوفی صاحب کا حنفی المذہب ہونا ثابت ہوتا ہے۔اس کے بعد امام مالک کی سرخی ہے۔

بود مالک محدث دوران قدوۃ دین مقتدائے جہان
شافعی بود خاص شاگردش ہم چوں پرواز بود در گردش

امام شافعی کا ذکر ہے۔لیکن امام حنبل کو نظر انداز کر دیا ہے۔محدثین میں صحاح ستہ سے صرف دو حضرات کا بیان ہے۔بقیہ صوفی صاحب کی نظر انتخاب میں نہیں آئے۔امام بخاری اور امام مسلم دونوں کو صوفی صاحب نے رضی اللہ عنہ سے ملقب کیا ہے۔

ان محمد کہ ابن اسماعیل برّہ حق بخلق بود دلیل
بود عالم بہ علم دین حدیث قطع شک کردہ از بہ فن حدیث

اور صحیح مسلم کے عنوان سے ”صاحب کتاب صحیح مسلم رضی اللہ عنہ“

چونکہ تصنیف در حدیث نمود ان کتاب صحیح مسلم بود
ہاتف غیب گفتہ است بدان سال ثقار او تو نافع خوان

ف ۱۰۳ھ

ان محترم، مقدس، متبرک ہستیوں کے اس قدر اختصار سے جائزہ لینے پر بھی مقالہ کے اتنے صفحات صرف ہو گئے لیکن حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔یوں مخزن کائنات کا جز اول تمام ہوا۔جو صفحہ اول سے ۶۵ تک محیط ہے۔دوسرا جز صفحہ ۶۵ سے صفحہ ۱۲۸ تک دراز ہے جس میں

از ہمہ اولیا کہ مشہور اند از عرب تا بہ ہند مشہور اند

عرب، عجم، کاشغر و ہند کے صوفیائے کرام، علمائے عظام، فقہا، حکما، متکلمین (امام غزالی، مولانا روم) شعرائے عارفین (امیر خسرو، شیخ سعدی، حافظ شیرازی) بلکہ اولوالعزم فاتحین امیر تیمور، محمود غزنوی، بہرائچ والے غازی سالار مسعود شہید تک ہیں۔تبرکاً کاشغر کے ایک صوفی کا نام لکھ دیا جاتا ہے، نہ جانے کتنے ہوئے ہوں گے۔

قبلہ امت است سعدالدین کاشغر داشت موطن تمکین

مثنوی مخزن کائنات کے جزدوم میں ہندو بیرون ہند کے ۱۷۵ مشائخ کے اسمائے گرامی لائے ہیں۔ظاہر ہے فقط ۶۲ صفحات میں اتنے سارے نام؟ یوں یہ سوانحی مثنوی کتاب فہرست بن گئی ہے۔صوفی صاحب کی خاص دلچسپی وفن کاری تاریخ تولد ورحلت سے ہے جس کے تاریخی مادہ نکالنے میں مہارت دکھائی ہے۔عجیب عجیب ڈھنگ اور سورنگ سے تاریخ نکالے ہیں مثلاً: شہاب الدین سہروردی کی پیدائش ۵۱۴ھ کی ہے، پورا نام آ گیا ہے۔

سال میلاد گفت مظہر دین اکمل اولیا شہاب الدین

م ۵۴۱ھ

شمس تبریز کے سن وفات کے لیے:

گفت دل سلطان شمس الدین بود

ف ۶۴۵ھ

مخزن کائنات میں جتنے نام آئے ہیں، تقریباً سب کے ذکر سے سیرت الاولیا کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔اکثر جن کے مزارات سے عوام الناس عقیدت رکھتے ہیں۔راقم السطور کو کوئی منفرد بات نظر نہیں آتی۔اس لیے صرف نظر کیا جاتا ہے۔اگر قارئین کو دلچسپی ہوگی تو کسی قسط میں بیان کیا جائے گا۔

لیکن وہ مشائخ جو ہندوستان کے ہیں، جنہیں صوفی صاحب نے مثنوی میں دیگر ازعمگان ہند زمین کہا ہے۔ان کے نام اور سن وفات لکھنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔یہ ہندوستانی علما وفضلا، صوفیائے کرام سرزمین گجرات سے بنگال تک، ملتان و لاہور سے دہلی و آگرہ، لکھنؤ، ردولی، میرٹھ، امیٹھی، اعظم گڑھ کی قدیم بستیاں، بنارس، الہ آباد، بہار میں دربھنگہ، پٹنہ، راجستھان میں ناگور، نارول سرہند وغیرہ وہ بہت سے نام جو صوفی صاحب کی نظر انتخاب میں تھے آج امتداد زمانہ کے ہاتھوں دھندلا گئے ہیں۔

صاحب مثنوی احسن اللہ علوی نے دہلی کے مشائخ کا نام کم بیان کیا ہے ورنہ ایک اور مخزن کائنات کا در کھل جاتا۔شاید وجہ یہ رہی ہو۔آفتاب کو چراغ دکھانا کیا ضرور تھا؟ صوفی صاحب جونپور

کے باشندہ ہیں، جسے شیراز ہند کہا جاتا تھا۔ دہلی کے فرماں روانے شرقی حکومت ختم کر کے جونپور کی انیٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ شیراز ہند کا ہر میدان میں دہلی والوں سے سابقہ رہتا تھا۔ خست برتی ہو بہرکیف۔ صاحب بیاض، صوفی موصوف کی نظر انتخاب میں جو ہندی نام آئے ہیں ان کو الگ کرنے میں دقت ہوتی ہے۔ راقم نے کوشش یہ کی ہے کہ انہیں علاقہ جات میں تقسیم کر دیا ہے۔

محققین اور اہل قلم (تاریخ وسیر) کے لیے یہ قلمی نسخہ ممد ثابت ہوسکتا ہے۔ صاحب مثنوی حضرت احسن اللہ علوی مرحوم ومغفور جونپور کے باشندہ تھے۔ اسی قلبی تعلق وہم آہنگی سے موصوف نے مشائخ جونپور کا ذکر مخزن کائنات کے صفحہ ۱۲۹ سے آخر تک یعنی خاتمۂ کتاب تک کیا ہے، کم وبیش ۹۰ شخصیتیں زیر قلم لائے ہیں۔

خاتمہ کتاب کا عنوان قائم کر کے صوفی صاحب نے اپنے حالات وشجرۂ نسب بیان کیا ہے جو صفحہ ۱۸۶ تک ہے اور نہ جانے کتنے صفحات ضائع ہوئے ہوں گے۔ مشائخ جونپور جن میں علما، فضلا، صوفیہ، صاحب قضایا، غرض ایک گلدستہ ہے۔ ان کے لیے راقم السطور نے ایک قسط مقرر کی ہے، جن کا ذکر آیندہ انشاء اللہ۔

حواشی

(۱) شبلی اکیڈمی کی لائبریری میں مخطوطات کے رجسٹر میں اس عنوان کے لیے PsysicalDiscription آیا ہے۔ (طبعی وضاحت) (۲) اس مصرعہ کا اشارہ مشائخ جونپور کی طرف ہے اور اکٹھا ۸۸ نام لائے ہیں، جو دوسری قسط میں رقم ہوں گے، انشاء اللہ۔

مولود کعبہ کی تعیین اور ایک غلط فہمی کا ازالہ

مفتی محمد راشد ڈسکوی

سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کی جماعت کے ہر ہر پھول کی خوشبو اور صفات ایک دوسرے سے جدا جدا ہیں، ہر صحابی کی اپنی مخصوص صفت کی وجہ سے اپنی ایک مخصوص پہچان تھی، اسی گل دستے کے ایک پھول کا نام ''حکیم بن حزام'' بھی ہے، ان صاحب کی ایک پہچان اور خصوصیت ایسی ہے، جس سے کوئی اور متصف نہیں ہے اور وہ ہے ''ان کا بیت اللہ کے اندر پیدا ہونا''۔

کعبہ میں پیدائش کا قصہ: قصہ کچھ اس طرح ہوا کہ واقعہ فیل سے تیرہ سال قبل کا دور تھا، ان کی والدہ حاملہ تھیں، وقت ولادت قریب تھا، زیارت کعبہ کے لیے تشریف لے گئیں تو حصول برکت کی نیت سے اندر داخل ہو گئیں، وہاں دردزہ میں مبتلا ہو گئی تو اندر ہی ایک چمڑے پر آپ کو جنم دیا۔

حضرت حکیم بن حزامؓ فرماتے ہیں کہ جب نبی اکرمؐ کے دادا عبدالمطلب نے اپنی نذر و منت کی بنا پر آپؐ کے والد ''عبداللہ'' کو قربان کرنا چاہا تو اس وقت میں سمجھ بوجھ رکھنے والا بچہ تھا۔

نبی اکرمؐ کے ساتھ تعلق: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعلان نبوت سے پہلے ہی یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوست تھے اور دعویٰ نبوت کے بعد بھی انہوں نے نبی اکرمؐ کے ساتھ اپنی سابقہ دوستی اور محبت میں کوئی کمی نہیں آنے دی، بعثت کے اعلان کے بعد جب قریش مکہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پورے خاندان (بنو ہاشم اور بنو مطلب) کا بائیکاٹ کیا اور ان کو شعب ابی طالب میں محصور کر دیا اور ان سے ہر طرح کے لین دین کی مقاطعت کر دی تو اس وقت بھی حضرت حکیم بن حزامؓ ملک شام کی طرف سے آنے والے تجارتی قافلوں سے خاموشی کے ساتھ سامان خرید کر اپنی پھوپھی حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے اکرام میں

رفیق شعبہ تصنیف وتالیف واستاذ جامعہ فاروقیہ، کراچی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پورے قبیلے والوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔

حضرت زید بن حارثہؓ کو انہوں نے ہی خریدا تھا، ان سے حضرت خدیجہؓ نے خریدا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدیہ دے دیا اور آپؐ نے انہیں آزاد کر دیا۔

ان کے اسلام لانے کا زمانہ: لیکن اس سب کے باوجود انتہائی تعجب اس امر پر ہے کہ انہوں نے اسلام بہت تاخیر سے قبول کیا، حتی کہ فتح مکہ کے موقع پر اسلام میں داخل ہوئے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فتح مکہ کے لیے نکلے تو یہ اور ابوسفیان سرداران مکہ کی طرف سے بطورِ جاسوس مسلمانوں کے لشکر کی طرف نکلے تھے، اس موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت سفیان کے لیے امان حاصل کر لی، اسی سبب سے حضرت سفیان مسلمان بھی ہو گئے۔ پھر دوسرے دن صبح کے وقت حضرت حکیم بن حزامؓ بھی خدمت نبوی علی صاحبہا الصلاۃ والسلام میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔ اس وقت جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تالیفِ قلب میں یہ اعلان کروایا کہ جو شخص "حکیم بن حزام" کے گھر داخل ہو گیا، اسے بھی امان ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ حنین میں شرکت: اس کے بعد انہوں نے جناب نبی اکرمؐ کے ساتھ شریک ہو کر غزوہ حنین میں حصہ لیا۔ جب کہ اسلام لانے سے قبل یہ کفار کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف غزوہ بدر میں بھی شریک ہوئے تھے، اس غزوہ میں یہ آپؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کے ہاتھوں قتل ہونے سے بہ مشکل بچ پائے تھے، مسلمان ہو جانے کے بعد اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جب بھی قسم کھاتے تو اس طرح قسم کھایا کرتے تھے: "اس ذات کی قسم! جس نے مجھے بدر کے دن قتل ہونے سے بچا لیا تھا"۔

استغناء نفس: اسی غزوہ حنین کا قصہ ہے کہ جب مال غنیمت تقسیم ہوا تو آپؐ نے انہیں تالیف قلب کے لیے ایک سو اونٹ عطا فرمائے، انہوں نے مزید کا مطالبہ کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور عطا فرما دیے، انہوں نے مزید اور کا مطالبہ کیا، تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: اے حکیم! یہ مال بظاہر شیریں چیز ہے، لیکن جس نے اسے دل کی بے نیازی کے ساتھ لیا، اس شخص کو اس مال میں برکت دی جائے گی اور جس نے اسے نفسانی خواہش کے ساتھ لیا تو اس کے لیے اس میں برکت نہیں ہو گی اور وہ شخص اس طرح ہو گا کہ اسے استعمال کرے گا لیکن وہ سیر نہیں ہو گا"۔ اس پر انہوں نے قسم کھا لی کہ قسم ہے اس

ذات پاک کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا، میں آپ کے بعد کسی کا بھی احسان قبول نہیں کروں گا، چناں چہ انہوں نے آپ کے بعد کبھی کسی کا احسان قبول نہیں کیا، آپ علیہ الصلاۃ والسلام کے دور کے بعد خلفائے راشدینؓ کے دور گذرے، وہ حضرات فتوحات کے موقع پر ان کو کوئی پیشکش کرتے تو وہ انکار فرمادیا کرتے تھے، لیکن اس کے باوجود وہ بڑے مال دار تھے، جس دن حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا اور انہوں نے اپنے بیٹے کو اپنے قرضوں کی ادائیگی کی وصیت کی تو ایک لاکھ درہم کا قرضہ حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کا نکلا۔

مالی ثروت اور عزت وجاہ: ''دارالندوہ'' (قریش کے لیے یہ گھر قائم مقام عدالت کے تھا، یہاں سرداران قریش کی مجالس ومحافل جما کرتی تھیں، اس جگہ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس مکان میں کوئی ایسا شخص داخل نہیں ہوسکتا تھا، جس کی عمر چالیس سال سے کم ہو، سوائے حضرت حکیم بن حزامؓ کے کہ ان کی عمر اس وقت پندرہ سال تھی، جب وہ اس گھر میں کفار ومشرکین کی مجالس میں شریک ہوا کرتے تھے) انہی کی ملکیت تھا، جو آپ علیہ الصلاۃ والسلام اور خلفائے راشدین کے زمانے میں ان کے پاس ہی رہا، بعدازاں انہوں نے وہ ''دارالندوہ'' ایک لاکھ درہم (اور ایک روایت کے مطابق چالیس ہزار دراہم) کے بدلے سیدنا امیر معاویہؓ کے ہاتھ فروخت کردیا، اس موقعے پر حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ نے ان سے کہا کہ آپ نے تو قریش کی عزت (والی جگہ) فروخت کردی، انہوں نے جواب میں فرمایا: بھتیجے! تقوی کے سوا تمام کام ختم ہوگئے اور ہوجائیں گے، صرف تقوی ہی باقی رہے گا، اے بھتیجے! میں نے یہ مکان شراب کے ایک مشکیزے کے بدلے خریدا تھا، اب میں اس کے بدلے جنت میں گھر خریدوں گا، اے بھتیجے! تم گواہ رہو، میں نے اس گھر کے بدل میں ملنے والی رقم کو اللہ کی راہ میں دے دیا۔

سخاوت: آپ سخاوت میں بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے، حضرت زبیر بن بکار کا بیان ہے کہ ایک سال حضرت حکیم بن حزامؓ نے حج کیا، ان کے ساتھ سو اونٹ اور سو بکریاں اور سو خدمت گذار تھے، جن کی گردنوں میں چاندی کے ہار تھے، جن پر لکھا ہوا تھا کہ یہ حکیم بن حزام کی طرف سے اللہ کی راہ میں آزاد کردہ غلام ہیں، انہوں نے ان سب کو آزاد کردیا اور تمام جانور انہیں ہدیہ دے دیے۔

نام ونسب: پورا نام ونسب: ''حکیم بن حزام بن خویلد بن اسد'' ہے، بیٹے کا نام ''خالد'' ہونے کی وجہ سے ان کی کنیت ''ابوخالد مکی'' تھی۔ خاندانِ نبویؐ کے ساتھ بھی ان کا ایک رشتہ ہے کہ

آپ علیہ الصلاۃ والسلام کی سب سے پہلی زوجہ مطہرہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا ان کی پھوپی تھیں۔

عمر اور وفات: انہوں نے ایک سو بیس سال کی عمر پائی اور عجیب بات یہ کہ ان کی زندگی کے ساٹھ سال کفر کی حالت میں گذرے اور ساٹھ سال اسلام کی حالت ان کی وفات کس سال میں ہوئی؟ اس بارے میں چار اقوال ملتے ہیں، ۵۰ھ، ۵۴ھ، ۵۸ھ اور ۶۰ھ۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ۔ (**البداية والنهاية، سنة أربع وخمسين، حكيم بن حزام**: ۸/ ۶۸، دارالفکر۔ **الإصابة في تمييز الصحابة، ذکر من اسمه حکیم**: ۲/ ۱۱۲، دارالجیل، بیروت)

بیت اللہ میں کس کس شخص کی پیدائش ہوئی؟: جیسا کہ ان صحابی رسولؐ حضرت حکیم بن حزامؓ کے بارے میں ذکر ہوا کہ ان کی پیدائش بیت اللہ کے اندر ہوئی تھی، تو اسی طرح کوئی اور بھی شخص بیت اللہ کے اندر پیدا ہوا یا نہیں؟ اس بارے میں تتبع کتب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ راجح قول کے مطابق بیت اللہ کے اندر ان کے علاوہ کسی اور شخص کی ولادت نہیں ہوئی۔ ملاحظہ ہو:

''المستدرک علی الصحیحین'' میں مذکور ایک روایت کے راوی ''حضرت مصعب بن عبداللہ'' حضرت حکیم بن حزامؓ کے بیت اللہ کے اندر پیدا ہونے کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ''ولم يُولَد قبلَه ولا بعدَه في الكعبة أحدٌ'' کہ ان سے پہلے اور نہ ہی ان کے بعد کوئی بھی کعبہ میں پیدا نہیں ہوا۔ (المستدرک علی الصحیحین، **ذکر مناقب حکیم بن حزام القرشی**، رقم الحدیث: ۶۰۴۴، ۳/ ۵۵۰، دارالکتب العلمیہ)

اس کے علاوہ حضرت حکیم بن حزامؓ کے بیت اللہ کے اندر پیدا ہونے کا ذکر امام مسلمؒ نے ''صحیح مسلم'' (رقم الحدیث: ۱۵۳۲، **کتاب البیوع، باب: الصدق في البیع والبیان**) میں۔ علامہ مناویؒ نے ''فیض القدیر'' (رقم: ۱۲۶۰، ۲/ ۳۷) میں۔ علامہ ذہبیؒ نے ''سیر اعلام النبلاء'' (رقم الترجمۃ: ۱۲، حکیم بن حزام: ۳/ ۴۶) میں۔ علامہ ابن حبانؒ نے ''الثقات'' (رقم الترجمہ: ۲۲۵، ۳/ ۷۱) میں کیا ہے۔

نیز کتب الرجال میں جہاں بھی حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کا ترجمہ موجود ہے، وہاں ان کے بارے میں یہ بات موجود ہے کہ وہ بیت اللہ کے اندر پیدا ہوئے۔

سیدنا علی المرتضیٰؓ کی بیت اللہ میں ولادت کی تحقیق: بعض حضرات نے خلیفہ رابع، امیر المومنین حضرت علی المرتضیٰؓ کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ ان کی پیدائش بھی بیت اللہ کے اندر ہوئی تھی، ملاحظہ ہو:

''امام حاکمؒ نے المستدرک میں ایک روایت ذکر کی ہے، جس میں راوی حدیث مصعب بن عبداللہؒ حضرت حکیم بن حزامؓ کے بیت اللہ کے اندر پیدا ہونے کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ''ولم یولد قبله ولا بعده في الكعبة أحد'' کہ ان سے پہلے اور نہ ہی ان کے بعد کوئی بھی کعبہ میں پیدا نہیں ہوا۔ لیکن اس پر امام حاکم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وَهِمَ مصعبٌ في الحرف الأخير، فقد تواترت الأخبار أن فاطمة بنت أسد ولدت أمير المؤمنين علي بن أبي طالب كرم الله وجهه في جوف الكعبة'' کہ اس آخری بات میں ''مصعب'' کو وہم ہوگیا ہے، اس لیے کہ یہ بات تواتر سے ثابت ہے کہ فاطمہ بنت اسد نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بیت اللہ کے اندر جنم دیا ہے۔ (المستدرک علی الصحیحین، ذکر مناقب حکیم بن حزام القرشی رضی اللہ عنہ، رقم الحدیث: ۶۰۴۴، ۳/۵۵۰، دارالکتب العلمیہ)

شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''واز مناقب علیؓ کہ در حین ولادت او ظاہر شد یکی آن است کہ در جوف کعبہ معظّمہ تولد یافت۔ قال الحاكم في ترجمة حكيم بن حزام قول مصعب، فيه: ''ولم يولد قبله ولا بعده في الكعبة أحد'' مانصه: ''وهم مصعب في الحرف الأخير، فقد تواترت الأخبار أن فاطمة بنت أسد ولدت أمير المؤمنين علي بن أبي طالب كرم الله وجهه في جوف الكعبة''۔ (ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء: ۶/۳۵۹)

لیکن یہ بات دعوی بلا دلیل کی قبیل سے ہے، اس لیے کہ کتب احادیث یا کتب رجال میں حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی بھی شخص کے بیت اللہ میں پیدا ہونے کا ذکر موجود نہیں ہے، چہ جائے کہ اس بارے میں روایات یا آثار واخبار تواتر تک پہنچی ہوئی ہوں، حد تواتر تک پہنچ جانے والی روایات کو نہ تو امام حاکمؒ نے ذکر کیا اور نہ ہی کسی اور کتاب میں وہ ملتی ہیں۔

رہ گئی قائلین کی بات تو وہ محض یہی بات ہے، جو بلا کسی سند کے ساتھ ذکر کی گئی ہے۔ نیز قائلین میں سے تقریباً سب ہی نے امام حاکمؒ کے قول کو بنیاد بناتے ہوئے اس بات کا ذکر کیا ہے، جب کہ علامہ سیوطیؒ اور علامہ نوویؒ نے بالتصریح ان حضرات کی تردید فرمائی ہے۔

علامہ سیوطیؒ نے امام حاکم رحمہ اللہ کے قول کو ضعیف قرار دیا ہے۔

قال شيخ الإسلام: ولا يعرف ذٰلک لغيره، وما وقع في "مستدرک الحاكم" من أن عليا وُلِدَ فيها - ضعيفٌ۔ (تدريب الراوي، النوع الستون: التواريخ والوفيات، الفرع الثاني: صحابيان عاشا ستين سنة في الجاهلية: ۲/۴۸۲دار العاصمة)

اور علامہ نوویؒ نے بھی امام حاکم رحمہ اللہ کے قول کو ضعیف قرار دیا ہے۔

"قالوا: ولد حكيم (بن حزام) في جوف الكعبة، ولا يعرف أحد ولد فيها غيره، وأما ما روي أن علي بن أبي طالب رضي الله عنه ولد فيها؛ فضعيف عند العلماء"۔ (تهذيب الأسماء واللغات للنووي حرف الحاء حكيم بن حزام: ۱/۱۶۶، دار الکتب العلمیۃ)

اس کے علاوہ علامہ حسین بن محمد الدیار البکری (المتوفی: ۹۶۶ھ) نے تاریخ الخمیس میں ذکر کیا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کعبہ میں پیدا ہوئے، لیکن یہ بات ثابت نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو: "ويقال: ولادته في داخل الكعبة، ولم يثبت"۔ (تاريخ الخميس في أحوال أنفس النفيس، ذكر علي بن أبي طالب: ۲/ ۲۷۵، دار صادر)

اسی طرح شرح نہج البلاغہ لابن عبد الحمید بن ہبۃ اللہ (المتوفی: ۶۵۶) میں مذکور ہے: "واختلف في مولد علي (رضي الله عنه) أين كان؟ فكثير من الشيعة يزعمون أنه ولد في الكعبة، والمحدثون لا يعترفون بذٰلک، ويزعمون أن المولود في الكعبة حكيم بن حزام بن خويلد بن أسد بن عبد العزى بن قصي"۔ (شرح نهج البلاغة، القول في نسب أمير المؤمنين علي بن أبي طالب وذكر لمع بسيرة من فضائله: ۱/ ۱۴، دار الجیل)

اسی طرح السيرة الحلبية لعلي بن إبراهيم الحلبي (المتوفی: ۱۰۴۴ھ) میں مذکور ہے: "وكون علي ... ولد في الكعبة ... قيل الذي ولد في الكعبة حكيم بن حزام قال بعضهم: لا مانع من ولادة كليهما في الكعبة لٰكن في النور: حكيم بن حزام ولد في جوف الكعبة ولا يعرف ذٰلک لغيره وأما ما روي أن علياً ولد فيها فضعيف عند العلماء"۔ (السيرة الحلبية، باب تزوجه صلى الله عليه وسلم خديجة بنت خويلد: ۱/۲۰۲)

ہوسپٹن :
برصغیر میں جہاں پہلے پہل
حفظ قرآن کا باقاعدہ نظام قائم ہوا

جناب عبدالمتین منیری

ہندوستان کے مغربی ساحل پر گوا کے جنوب میں قومی شاہراہ نمبر (۱۷) کے ساتھ ساتھ ریاست کرناٹک کے علاقے کینرا کی سرحد میں جب ہم داخل ہوتے ہیں تو مغربی گھاٹ کے جنگلوں اوراس کے آبشاروں سے نکل کر بحر عرب میں گرنے والی ندیوں اور دریاؤں کا ایک سلسلہ شروع ہوجاتا ہے، ان میں سے کالی اور مرجان ندی سے گذرنے کے بعد ایک لمبی چوڑی ندی آتی ہے جو شراوتی کہلاتی ہے۔ یہ ندی گیرسوپا کے مشہور عالم آبشار جوگ فال سے نکل کر کھاڑی پر ناریل کے درختوں سے بھرے پرے چھوٹے چھوٹے جزیرے بنا کر سمندر میں مل جاتی ہے۔ اس ندی کے دونوں کناروں پر ایک تعلقہ آباد ہے جو ہناور (Honavar) کہلاتا ہے۔ عرب جغرافیہ دانوں نے اپنی کتابوں میں اس کے لیے ہنور کا لفظ اور پرتگالی اور انگریز مورخین نے اس کے لیے Honore یا Onore کا لفظ استعمال کیا ہے۔ موجودہ ہناور کا قصبہ ندی کے شمالی کنارے پر آباد ہے۔ لیکن جب ہم ندی کو پار کرکے جنوبی کنارے پر پہنچتے ہیں تو شاہراہ سے بائیں جانب کو ایک چھوٹی سڑک جاتی ہے جو کچھ دور ہناور کے ریلوے پل کے جنوبی سرے پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ یہیں پر ندی کنارے ایک گاؤں آباد ہے جو ہوسپٹن Hosapatna کہلاتا ہے۔ وکٹر ڈیسوزا (۱) نے لکھا ہے کہ یہ کنڑی زبان کے دو لفظ ہوسا Hosa (نیا) اور پٹن Patana (بندرگاہ یا شہر) سے مل کر بنا ہے، اس کا مطلب ہوا نیا آباد شدہ شہر، اس مصنف اور ایک دوسرے مورخ مولانا خواجہ بہاء الدین اکرمی (۲) کا بیان ہے کہ یہاں سے سو کلومیٹر کی حدود کے

دارالمعارف، ۱۰۸۸، امین الدین روڈ، بھٹکل۔ amuniri@gmail.com

اندر بھٹکل اور دوسرے قصبات میں بسنے والے عرب نژاد قبیلے نوائط کے آباء واجداد یہیں سے ہجرت کر کے ان علاقوں میں منتشر ہوئے تھے۔لفظ نوائط کی مورخین نے کئی توجیہات کی ہیں،لیکن برنل، ڈیمس، بریجس اور دیسوزا کی یہ توجیہ زیادہ قرین قیاس لگتی ہے کہ یہ سنسکرت یا فارسی کے دوالفاظ نو (Nawa نئے) آید/ آیتا (Aayata آئے ہوئے) سے مرکب ہے(۳)۔اس کا مطلب ہوا نئے شہر میں آباد ہوئے نووارد لوگ۔

مورخین کے مطابق اہل نوائط حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں،ان کی مدینہ منورہ سے ہوتے ہوئے بغداد اور بصرہ ہوتے ہوئے اس علاقے میں ۷۵۲ھ/ ۱۳۵۱ء کے آس پاس ہرمز اور خلیج فارس کے راستے ہجرت ہوئی تھی (۴)،اسی زمانے میں صلیبی جنگوں اور اندلس پر عیسائیوں کے قبضہ کے بعد یورپ کی نشات ثانیہ کا آغاز ہوا تھا،یورپ میں تہذیب وتمدنی زندگی کے آغاز کے ساتھ ہی ہندوستانی مصالحہ جات،اناج اور مصنوعات یہاں کی زندگی کا لازمی جزء بن گئیں اور بحر عرب کے دونوں کناروں پر واقع بندرگاہوں کے توسط سے بحری تجارت کو فروغ ملا، بحر احمر کے دہانے پر واقع (عدن) اور خلیج فارس کے دہانے پر واقع (ہرمز) دوایسی بندرگاہیں تھیں جن کے راستے ہندوستانی سامان تجارت یورپ کی منڈیوں میں پہنچتا تھا، یہ عہد وسطی میں جہاز رانی اور بحری تجارت کا سنہرا دور تھا، ہندوستان کے ساحل پر نووارد نوائط اس تجارت میں مرکزی عنصر کی حیثیت اختیار کر گئے تھے، کیونکہ یہ جہاز رانی کے ساتھ تجارت میں بھی یکتا تھے، چونکہ مقامی ہندو سامان تجارت تیار کرتا تھا، لیکن بحری سفر اور جہاز رانی سے اس کا سروکار نہیں تھا، وہ انہی نوائط کے توسط سے اپنا سامان تجارت عرب اور یورپ کی منڈیوں میں پہنچاتا تھا، اس طرح مقامی لوگوں اور ان نوواردوں کے درمیان ایک دوسرے کے مفادات اور ضرورتوں کی وجہ سے یہاں پر تجارتی دشمنی اور مخاصمت کے بجائے دوستی اور مفاہمت کی فضا قائم ہوگئی تھی، چونکہ زمانہ جاہلیت سے ان ساحلوں پر عربوں کی آمد ہوتی تھی جہاز رانی کے اس عہد عروج میں ان نئے آنے والوں کو دوسروں سے ممیز کرنے کے لیے شاید نوآید (نوائت) اور ان کی نئی آبادی کو (ہوسپٹن) کہا گیا، اور مرور زمانے سے حرف (ت) قرشت (ط) حطی میں بدل گئی۔

ہوسپٹن میں جب آپ داخل ہوں تو وہاں پر لگے ہوئے نئے سائن بورڈ کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے یہ کوئی مندروں کا شہر ہو لیکن اس کے اطراف واکناف کے قصبوں بھٹکل، کائی کینی، گیرسوپا وغیرہ

کے برخلاف جہاں پانچ چھ سو سالہ پرانے جین مندر، اور محلات نظر آتے ہیں، یہاں دس بیس سال سے زیادہ پرانا کوئی مندر نظر نہیں آتا، سب قریبی دور کی تعمیرات ہیں، البتہ جو چیز یہاں پر دیکھنے والے کو فرط حیرت میں ڈال دیتی ہے وہ ہے ایک ایسی جگہ جہاں کوئی بھی مسلم گھر موجود نہ ہو، وہاں پر ایک گھر کے پچھواڑے میں ایستادہ کئی صدیوں سے ایک ٹوٹا پھوٹا قدیم مسجد کا مینار، یہ اور اس کے قریب مسلم محلہ کے چند کھنڈرات کی وکٹر ڈیسوزا نے ۱۹۵۵ء میں جو تصویر اپنی کتاب کی زینت کی ہے، وہ اپنی جگہ پر اب بھی باقی ہیں، اب یہ دونوں گھر کے آنگن اور پچھواڑے میں آ گئے ہیں۔ فسطائی تحریکات کے اس دور میں اب چار دیواری پھلانگ کر وہاں تک جانا دشوار سا ہو گیا ہے۔

یہی ہوسپٹن مشہور عرب سیاح ابن بطوطہ کی ذکر کردہ سلطنت ہنور کا مرکز تھا۔ مورخ ہند حکیم عبدالحی حسنی مرحوم نے نوائط سے تعلق رکھنے والے ایک بزرگ مخدوم علاء الدین علی المھایمیؒ کے تذکرے میں لکھا ہے کہ (میرے نزدیک ہندوستان کے ہزار سالہ دور میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے سوا حقائق نگاری میں ان کا کوئی نظیر نہیں، مگر ان کی نسبت یہ معلوم نہیں کہ وہ کس کے شاگرد تھے کس کے مرید تھے اور مراحل زندگی انہوں نے کیوں کر طئے کیے تھے، جو تصنیفات ان کی پیش نظر ہیں ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہیں کہ ایسا شخص جس کو ابن عربی ثانی کہنا زیبا ہے، وہ کسمپرسی کی حالت میں ہے، کہیں اور ان کا وجود ہوا ہوتا تو ان کی سیرت پر کتنی کتابیں لکھی جا چکی ہوتیں اور پُر فخر لہجہ میں مورخین ان کی داستانوں کو دہراتے (۵)۔ کچھ یہی صورت حال ہوسپٹن کی باقی ماندہ مسجد کے مینار اور محلے کے کھنڈرات کی بن گئی ہے۔ اگر ان کی صفائی کر کے مرمت کی جائے اور جھاڑ جھنکار سے انہیں پاک کیا جائے تو شاید یہ ریاست کرناٹک میں اسلامی تاریخ کی سب سے قدیم یادگار بن جائے۔ لیکن جو حالات ہیں انہیں دیکھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے اب ان یادگاروں کے دن گنے چنے ہیں۔

ابن بطوطہ (۷۷۹ھ/۱۳۷۷ء) نے ہنور کا محل وقوع یوں بیان کیا ہے (جزیرہ انجدیو سے دوسری صبح ہم شہر ہنور پہنچے، یہ ایک بڑی کھاڑی پر واقع ہے، یہاں بڑی بڑی کشتیاں آ کر اترتی ہیں، سمندر شہر سے نصف میل دور ہے، بارش کے موسم میں اس سمندر کا جوش طغیانی بڑھ جاتا ہے اور چار ماہ تک اس میں مچھلی کے شکار کے علاوہ کوئی سواری کرنا ممکن نہیں۔ (٦)

وہ سلطنت ہنور اور اس کے سلطان جمال الدین ہنوری کے کوائف یوں بیان کرتا ہے۔

شہر ہنور کے باشندے شافعی مذہب ہیں۔ دیندار اور نیک بخت اور بحری طاقت کے لیے مشہور ہیں۔ سنداپور فتح ہونیکے بعد وہ اور کہیں کے نہ رہے تھے اس شہر کے عابدوں میں سے شیخ محمد ناگوری ہیں۔ انہوں نے میری دعوت اپنی خانقاہ میں کی، وہ اپنا کھانا آپ پکاتے ہیں۔ فقیہ اسماعیل کلام اللہ پڑھاتے ہیں۔ نہایت خوش اخلاق اور فیاض ہیں قاضی شہر نور الدین علی ہے۔ خطیب کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ اس شہر کی عورتیں اور اس پورے ساحل کی عورتیں سلا ہوا کپڑا نہیں پہنتیں۔ بغیر سلا کپڑا اوڑھتی ہیں چادر کے ایک آنچل سے تمام بدن لپیٹ لیتی ہیں اور دوسرے کو سر اور چھاتی پر ڈال لیتی ہیں (ساڑھی مراد ہے) یہ عورتیں خوبصورت اور باعفت ہوتی ہیں ناک میں سونے کا بلاق پہنتی ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ سب کی سب حافظ قرآن ہوتی ہیں۔ اس شہر میں تیرہ مکتب لڑکیوں کے اور بتیس لڑکوں کے ہیں۔ سوائے اس شہر کے یہ بات میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ یہ لوگ فقط بحری تجارت پر گزارہ کرتے ہیں۔ زراعت نہیں کرتے۔ مالابار کے لوگ بھی سلطان جمال الدین کو کچھ نہ کچھ خراج دیتے ہیں کیونکہ اس کے پاس بحری طاقت بہت بڑی ہے اور چھ ہزار پیادہ اور سوار بھی رکھتا ہے بادشاہ جمال الدین محمد بن حسن بڑا نیک بخت ہے وہ ایک ہندو راجہ کے ماتحت ہے، جس کا نام ہریب (ہری ہر) ہے، سلطان جمال الدین ہمیشہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا ہے اس کا دستور ہے کہ صبح ہونے سے پہلے مسجد میں چلا جاتا ہے اور صبح ہونے تک تلاوت کرتا رہتا ہے۔ اول وقت نماز پڑھتا ہے پھر شہر کے باہر سوار ہو کر چلا جاتا ہے چاشت کے وقت واپس آتا ہے پہلے مسجد میں دوگانہ پڑھ کر پھر محل میں جاتا ہے ایام بیض کے روزے رکھتا ہے۔ جب میں اس کے پاس ٹھہرا ہوا تھا تو افطار کے وقت مجھے بلا لیتا تھا۔(۷)

اس کے بعد ابن بطوطہ نے سلطان جمال الدین کی سنداپور (موجودہ chitakul یا Sadasivagarh) پر چڑھائی کی تفصیلات بیان کی ہیں، وہ کہتا ہے کہ (سلطان جمال الدین نے ۵۲ جہاز تیار کیے، اس کا ارادہ سنداپور پر چڑھائی کا تھا، وہاں کے راجہ اور اس کے بیٹے کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے تھے، راجہ کے بیٹے نے سلطان کو لکھا کہ اگر وہ سنداپور فتح کر لے تو وہ مسلمان ہو جائے گا اور سلطان اپنی بہن کا نکاح اس کے ساتھ کر دے گا۔(۸)

ابن بطوطہ نے اس کے بعد جنگ سنداپور کی تفصیلات بتائی ہیں۔ یہاں سے وہ کالی کٹ روانہ ہوا۔ کالی کٹ سے جب وہ سلطان ہنور کی زیارت کی غرض سے واپس لوٹا تو غالباً اس وقت تک

سلطنت ہنور کا خاتمہ ہوچکا تھا اور علاقے میں بدامنی پھیل چکی تھی، وہ بیان کرتا ہے کہ جب ہم ہنور اور فاکنور (بارکور) کے درمیان ایک جزیرے پر پہنچے تو کافر اپنی بارہ کشتیوں کے ساتھ نکل آئے، انہوں نے ہمارے ساتھ سخت لڑائی کی اور ہم پر غالب آگئے، جو کچھ ہم نے جمع کیا تھا اسے لوٹ لیا، جو کچھ ہیرے جواہرات شاہ سیلان نے ہمیں دیے تھے انہیں چھین لیا، میرے کپڑے اور بزرگوں اور اولیاء اللہ کی دی ہوئی تبرکات بھی لے لیں اور میرے پاس ایک تہ بند کے علاوہ بدن ڈھانکنے کے لیے کچھ نہ بچا۔ انہوں نے ہم سے سب کچھ چھین کر ساحل پر ہمیں چھوڑ دیا۔(۹)

وہ مزید لکھتا ہے کہ: میں یہاں سے ہنور پھر سنداپور کو لوٹا، یہاں میں محرم کے اواخر کو پہنچا اور ربیع الآخر کی دوسری تاریخ تک مقیم رہا، تو یہاں کے کافر راجہ جس کی سلطنت میں ہم گھس آئے تھے اس نے اسے واپس لینے کے لیے پیش قدمی کی، تمام کافر اس کے پاس بھاگ کر جمع ہوگئے، سلطان کی فوج دیہاتوں میں منتشر تھی، وہ ہم سے کٹ گئی، کفار نے ہمارا محاصرہ تنگ کیا، جب حالات اتنے سخت ہوئے تو میں وہاں سے سنداپور کو محصور چھوڑ کر نکل پڑا اور کالی کٹ کو لوٹ آیا۔(۱۰)

ابن بطوطہ کی وفات (۷۷۹ھ/۱۳۷۷ء) کو ہوئی، برنل نے ان کی اس علاقے میں آمد کی تاریخ قرائن سے ۷۴۳ھ/۱۳۴۲ء بتائی ہے(۱۱)۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سنداپور پر حملہ کے ایک سال بعد بکا اول مہاراجہ سلطنت وجے نگر (۱۳۴۳ء۔۱۳۷۹ء) کے دور حکومت میں سنداپور میں سلطان جمال الدین کی فوج دشمن کے گھیرے میں آگئی اور سنداپور اور ہنور دونوں جگہ ان کی فوجی قوت کا خاتمہ ہوا، وجے نگر کا مورخ رابرٹ سیول رقم طراز ہے کہ گوا کی بندرگاہ سے بلگام تک کا علاقہ اور تلوگھاٹ (کینرا) کے ضلع بکا اول کے قبضے میں آگئے۔(۱۲)

عرب مصنّفین میں ابن بطوطہ کے علاوہ ابوالفداء (۷۳۲ھ/۱۳۳۱ء) نے تقویم البلدان (۱۳) میں ہنور کا تذکرہ کیا ہے۔ ابوالفداء اور ابن بطوطہ میں دس سال کا فرق ہے، ان سے قدیم کسی اور عرب مورخ نے اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہنور کو شہرت اسی دور سے نصیب ہوئی۔

ابن بطوطہ کے بیان میں مندرجہ ذیل امور قابل غور ہیں۔ ان پر تحقیق کی صورت میں ہندوستان کی اسلامی تاریخ پر سے مزید پردے اٹھ سکتے ہیں۔

۱۔ ابن بطوطہ کے زمانے میں ہنور کے باشندے شافعی المذہب تھے، واضح رہے کہ شراوتی

ندی کے مغربی کنارے پر ہوسپٹن اور کاسرکوڈ سے ہندوستان میں شافعی مذہب کے ماننے والے مسلمانوں کا سلسلہ شروع ہوکر جنوب مشرقی ساحل پر کایل پٹم جاکر ختم ہوتا ہے۔ یہ ہندوستان میں سب سے قدیم نسل کے مسلمان شمار ہوتے ہیں۔ ہنور اور اس کے اطراف صرف نوائط برادری کے مسلمان ہی مذہب شافعی کے متبع ہیں، مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ بھٹکل واطراف کے نوائط سلطنت ہنور کی عرب نژاد مسلمانوں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں (۱۴)

۲۔ ابن بطوطہ نے آٹھویں صدی میں ہنور میں حفظ قرآن کے رواج اور مکاتب کے نظام کا تذکرہ کیا ہے، اس کا صراحت کے ساتھ یہ بیان ہے کہ سوائے اس شہر کے یہ بات میں نے کہیں نہیں دیکھی، چونکہ ہمارے علم کی حد تک کسی اور مورخ نے اس سے قبل ہندوستان میں حفظ قرآن کی تعلیم کے نظام کے بارے میں تفصیل نہیں بتائی ہے اور ابن بطوطہ نے تغلقی دور حکومت میں شمال تا جنوب مختلف سرکاری عہدوں پر رہ کر برصغیر کا مشاہدہ کیا ہے۔ یہ کہنے میں مضائقہ نہیں کہ برصغیر میں حفظ قرآن کا باقاعدہ ایسا نظام کہ تمام عورتیں بھی حافظ قرآن رہیں پہلے پہل سلطنت ہنور میں قائم ہوا۔ یہ سبقت اس سلطنت کے لیے بڑی باعث فخر ہے۔

قریبی دور میں بھٹکل کے ایک نامور رہنما جناب محی الدین منیریؒ اپنی تقاریر میں ہمیشہ ابن بطوطہ کے اس بیان کا حوالہ دیتے تھے، انہوں نے بچیوں کے لیے جامعۃ الصالحات کی بناڈالی تو ۱۹۸۰ء میں یہاں پر حفظ قرآن کا شعبہ قائم کیا، اس کی برکت ہے کہ آج بھٹکل میں سینکڑوں حافظات قرآن پائی جاتی ہیں اور ہر دو تین گھر چھوڑ کر خواتین ماہ رمضان المبارک میں تراویح میں پورا قرآن پاک سناتی ہیں اور چار پانچ مربع کلومیٹر پر محیط شہر بھٹکل کی تمام نوّے مساجد میں تراویح میں پورا قرآن سنانے کا اہتمام ہوتا ہے۔ ان میں زیادہ تر حافظات کی تعلیم دسویں اور حفاظ کی تعلیم عالمیت سے اوپر ہوتی ہے۔

۳۔ ابن بطوطہ نے سلطنت ہنور کے بحری بیڑے میں فوج کی تعداد چھ ہزار اور جنگی کشتیوں کی تعداد (۵۲) بتائی ہے۔ ہمارے علم کی حد تک یہ برصغیر کی کسی مسلم سلطنت کا پہلا بحری بیڑا ہے۔ یہ برصغیر کے مسلمانوں کی بدقسمتی رہی کہ یہاں مسلم حکمرانوں نے بحری بیڑے کی طرف توجہ نہیں دی، اسے انہوں نے بہادری کے خلاف سمجھا، اس سلسلہ میں شاہ گجرات محمود بیگڑا کا مشہور جملہ ہے کہ بحری بیڑوں وغیرہ سے ہمارا کیا کام یہ تو تاجروں کی چیز ہے۔

سلطنت ہنور صرف ہوسپٹن کا نام نہیں تھا، بلکہ آخرالذکر اس کا مرکز تھا، ایسا لگتا ہے کہ سلطنت ہنور کے خاتمہ کے بعد شراوتی ندی کے شمالی حصہ پر موجودہ ہناور قصبہ واطراف سے مسلمانوں کا انخلا ہونا شروع ہوا جو یکم مئی ۱۴۲۷ء اپنی انتہا کو پہنچا، اس تعلق سے وکٹر ڈیسوزا نے بڑی جانسوزی سے قریبی گاؤں کانکینی کے قریب واقع جین بستی میں موجود اس دور کی ایک قدیم پتھر کے ستون کی عبارت خوانی کر کے مہاراجہ دیو پرتاب (۱۴۱۹ء تا ۱۴۴۴ء) کے دور حکومت میں اس کے گورنر مہا پردھانا تمنا اوڈیا Maha pardhana Tmanna Adya سے اختلافات کی بنیاد پر مسلمان تاجروں کے سردار عمر مرکلا کے اپنے لوگوں کے ساتھ شراوتی کے جنوبی ساحل پر منتقل ہونے اور پھر یہاں پر بھی خوں ریزی اور جنگ کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ تاریخی قرائن سے ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ سلطنت ہنور کے زوال کے فوراً بعد یہاں سے مسلمانوں کا انخلا ہو گیا ہو، کیوں کہ اس واقعہ کے ایک سو سال بعد پرتگالی نامہ نویس جاؤ دی بیروس (۱۵۵۳ء) میں لکھتا ہے کہ:

> ”ہناور کی یہ بندرگاہ اور بھٹکل کی بندرگاہ جو کہ سات فرسخ کی دوری پر تھی دوسرے ساحلی علاقوں کی طرح وجے نگر کے تابع تھی راجہ ہناور اس کا باج گذار تھا، چالیس سال کے دوران ان دونوں بندرگاہوں کی پورے ساحل پر بڑی دھوم تھی، اس کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ یہاں کی زمین زرخیز تھی، اور بڑی مقدار میں یہاں غلہ ملتا تھا اور تمام جگہوں کے لیے یہاں سامان لادا جاتا تھا، بلکہ ان کی اہمیت اس لیے بھی تھی کہ سلطنت وجے نگر کی جملہ درآمدات اور برآمدات انہی بندرگاہوں سے ہوتی تھی، یہاں سے اسے نہ صرف بہت سالگان ملتا تھا بلکہ اس کی خاص وجہ عرب و فارس سے یہاں درآمد ہونے والے گھوڑے بھی تھے، جن کی وجے نگر کی فوج میں بڑی اہمیت تھی، کیوں کہ دکن کی مسلم سلطنت سے اس کی مسلسل جنگ جاری تھی، اس نے شمال کی جانب سے وجے نگر کا گھیرا تنگ کر رکھا تھا، اس کے بہت سارے علاقوں پر اس نے قبضہ کر لیا تھا، جنگی مدافعت میں یہ گھوڑے بنیادی قوت فراہم کرتے تھے، ان بندرگاہوں کی زرخیزی اور یہاں کی تجارت کی وجہ سے یہاں پر Naiteas (نائطی) کہلائے جانے والے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد آباد تھی، یہ گھوڑے خرید کر دکن

کے مسلمانوں کو فروخت کیا کرتے تھے، اس وجہ سے راجہ وجے نگر کو اس وقت بڑا نقصان اٹھانا پڑا جب کہ دکن کے ساتھ گھڑسوار فوج کی جنگ چھڑ گئی، یہ خسارہ اس وقت بہت بڑھ گیا جب گھوڑوں کی مانگ کی وجہ سے گھوڑوں کی قیمت دگنی ہوگئی۔ جب ریاست کو اس سے تکلیف محسوس ہونے لگی تو وجے نگر نے ہوناور کے اپنے باج گذار راجہ کو حکم دیا کہ وہ جتنا زیادہ ممکن ہو یہاں کے مسلمانوں کو قتل کرے تاکہ یہ ڈر کے مارے ملک چھوڑ کر بھاگ جائیں، پھر مسلمانوں کے سال ۹۱۷ھ جو کہ ۱۴۷۹ء بنتا ہے ہوناور اور بھٹکل کے تمام علاقوں میں سازش کے الزام میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا۔ جس میں دس ہزار مسلمان مارے گئے، جو بچ گئے انہوں نے جتھے بنائے اور یہاں سے نکل کر زوڈی Tissuari جزیرے میں بود و باش اختیار کی، یہیں سے شہر گوا کی بنیاد پڑی۔ ہوناور کے باجگذار کی جانب سے جو بدسلوکی ان مسلمانوں کے ساتھ کی گئی تھی، اس کے نتیجہ میں ہوناور کے ہندوؤں سے انہیں نفرت سی ہوگئی، انہوں نے گوا کو آباد کرنے اور یہاں کی تجارت کو دلکش بنانے، خاص طور سے گھوڑوں کی تجارت کو فروغ دینے، انہیں بآسانی سلطنت دکن کو روانہ کرنے کے انتظامات کے تعلق سے بڑی پھرتی سے اپنا کام پورا کیا، یہ کام انہیں اس وجہ سے بھی آسان ہوا کہ یہ سامان تجارت جہازوں پر چڑھانے والے جہاز راں مسلمان ہی ہوا کرتے تھے، انہیں بھٹکل اور ہوناور میں جو تکلیف دی گئی تھی اس کی وجہ سے انہوں نے فیصلہ کر دیا تھا کہ ہندوؤں کے بالمقابل وہ اپنے ہم مذہب مسلمانوں کا ساتھ دیں گے، اس کی وجہ سے ہوناور اور بھٹکل کی بندرگاہوں کا نقصان ہونے لگا''۔ (۱۵)

اس سلسلے میں سلطنت وجے نگر کے مورخ روبرٹ سیول Robert Sewell نے یوں لکھا ہے:

۱۳ رذی قعدہ ۸۶۷ھ / ۳۰ رجولائی ۱۴۹۳ء محمد شاہ بہمنی بادشاہ بنا، ۱۴۶۹ء کے اواسط میں جب کہ راج شیکھر ایا ویر پکشا اول وجے نگر کا گدی نشین تھا، محمد شاہ بہمنی کے وزیر محمود گاواں نے مغرب کی طرف کوچ کیا اور واضح طور پر ایک کامیاب مہم چلا کر گوا پر حملہ کر دیا، پھر اس کے بعد بر و بحر دونوں

راستوں سے وجے نگر کے رایا Raya کے مورچوں پر حملہ بول دیا، اس حملہ میں اسے فتح نصیب ہوئی اور یہاں کے تمام علاقہ جات پر اس کا قبضہ ہو گیا۔

بیروس کے بقول یہ غالباً ۱۴۶۹ء میں ہونے والے مسلمانوں کے وحشیانہ قتل عام کا بدلہ تھا، اس زمانے میں ساحلی علاقہ کی جملہ تجارت مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی، یہ مسلمان بڑی تعداد میں گھوڑے درآمد کرتے تھے، یہ گھوڑے بنیادی طور پر سلطنت دکن اور وجے نگر کی دو مد مقابل کثیر تعداد فوج میں استعمال ہوتے تھے، ہندو راجہ کی فوج کا دارو مدار انہی گھوڑوں کی درآمد پر تھا۔ (اس قتل عام کے بعد) بچ کر نکلنے والوں نے گوا میں پناہ لی، یہیں سے اس شہر کی بنیاد پڑی جسے ہندستان میں پرتگالیوں نے اپنی راجدھانی بنایا۔ Purcheas کا بیان ہے کہ یہ قتل عام ۱۴۷۹ء میں ہوا تھا۔ (۱۶)

ہنور اور بھٹکل میں قتل عام کے بعد گوا کی تاسیس اور اس کے نتیجہ میں وجے نگر کا جو تجارتی نقصان ہونے لگا اس کے بعد وجے نگر کی مزید کاروائی نے ہنور سے مسلمانوں کی مزید دوری کے جو اسباب پیدا ہوئے اس سلسلے میں بیروس مزید لکھتا ہے کہ راجہ وجے نگر نے اس حکم کے ساتھ کہ گھوڑے لانے اور سامان تجارت لانے والے جہازوں کو ان دونوں بندرگاہوں پر لانے کے لیے مجبور کیا جائے، انہیں گوا نہ جانے دیا جائے، اس نے راجہ ہناور کے پاس اپنے چار کپتان ایک بحری بیڑے کے ساتھ روانہ کئے، تاکہ یہ تمام جہازوں کو اپنی بندرگاہوں پر لانے کے لئے مجبور کرے، اور ان کی جانب سے مدافعت کی صورت میں قزاقی اور لوٹ مار سمیت ان جہازوں کو جو نقصان پہنچایا جا سکے پہنچائے، اس بحری بیڑے کا تیمیا Timmayya بڑا کپتان تھا، اس نے ساحل پر آباد مسلمانوں کو جتنا نقصان پہنچا سکا پہنچایا، اس رتبہ پر اس کے پہنچنے سے پہلے راجہ ہناور کے دوسرے کپتان یہاں ہوا کرتے تھے، اس وجہ سے راجہ ہناور اور حکومت گوا (عادل شاہی) میں ہمیشہ جنگ جاری رہتی تھی اور سینتا کورا Sintacora (Sadashivgarh) کا قلعہ دشمن کی سرحد کا کام دیتا تھا، مسلمانوں نے راجہ ہناور کے خلاف بہت زیادہ کامیابیاں حاصل کیں، خاص طور پر Sabia (یوسف عادل خان) کے گوا کا حاکم بننے کے بعد تو راجہ ہناور جو کہ ندی کے دہانے پر رہائش پذیر تھا بھاگ کر ندی کے اندرونی علاقے میں منتقل ہو گیا۔ (۱۷)

قصبہ ہوناور اللہ کے نام لیواؤں سے خالی نہیں ہوا، قریبی دور میں آئے ہوئے توحید کے

پرستار اب بھی وہاں موجود ہیں، لیکن ہوسپٹن جسے اس تاج کا ہیرا کہنا چاہئے اب سونا پڑا ہے، یہ بستی جہاں برصغیر کا کلام اللہ حفظ کرنے کا قدیم ترین باقاعدہ نظام قائم کیا گیا تھا مدت ہوئی اس کی فضاؤں میں تکبیر کی صدائیں گم ہوگئی ہیں۔ بس بوسیدہ مینار کا ایک ڈھانچہ ہے جو یاد دلاتا رہتا ہے کہ میر عرب کا کارواں کبھی یہاں سے گذرا تھا، یہاں بھی کبھی قال اللہ وقال الرسول کی صدائیں بلند ہوتی تھیں، لیکن مرور زمانہ نے قومی حافظے سے اس کا نام فراموش کردیا، یہاں کے اڑوس پڑوس میں اب جو ماحول بن گیا ہے اس سے اب ایسا نہیں لگتا کہ توحید کی وہ بہاریں یہاں دوبارہ لوٹائی جاسکیں گی، لیکن ایسا تو ہوسکتا ہے کہ قومی حافظہ میں اسے محفوظ رکھنے کا انتظام ہوتا کہ آیندہ نسلیں اس کی ضوپاشی سے منورہ سکیں۔

حوالہ جات

(۱) Kannada Research, S.D'sousa viktor,The Navayats of kanarap.47 1955, DharwarInistitute

(۲) عرب و دیار ہند، خواجہ بہاء الدین اکرمی ندوی، دارالسلام نوائط کالونی، بھٹکل، ۱۹۸۰ء، ص ۴۲۰۔

(۳) John ,Burnell.col.henry yule and A.C,hobson jobson ،p.620

Mensel Longworth ,The Book of Duarte Barbosa1903,Murray london p.2237vol.1,1918,hakluyt Society London,Dames

(۳) تاریخ فرشتہ، محمد قاسم فرشتہ۔ ترجمہ: محمد فدا علی طالب، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، ۱۹۲۴ء، ج ا۔ ص ۸۴۱

(۳) Kannada , S.D'sousa viktor,The Navayats of kanara p.12, 1955, Dharwar InistituteResearch

(۴) تاریخ النوائط، نواب عزیز جنگ بہادر، عزیز المطابع ۱۳۲۲ھ، ص ۷۳۔ (۵) یاد ایام، سید عبدالحی حسنی، انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج، ۱۹۱۹ء، ص ۵۹۔ (۶) رحلۃ ابن بطوطۃ المسماۃ تحفۃ النظار فی غرائب الامصار وعجائب الاسفار، ابن بطوطۃ: شمس الدین ابی عبداللہ محمد بن عبداللہ اللواتی الطنجی، تحقیق: عبدالھادی التازی، اکادیمیۃ المملکۃ المغربیۃ، ۱۹۹۷ء۔ ص ۴۴۔ ۴۵ (۷) رحلۃ ابن بطوطۃ المسماۃ تحفۃ النظار فی غرائب الامصار وعجائب الاسفار، ابن بطوطۃ:

شمس الدین ابی عبداللہ محمد بن عبداللہ اللواتی الطنجی، تحقیق: عبدالھادی التازی، اکادیمیۃ المملکۃ المغربیۃ، ۱۹۹۷ء۔ ۴۴۔۴۵ (۸) رحلۃ ابن بطوطۃ المسماۃ تحفۃ النظار فی غرائب الامصار وعجائب الاسفار، ابن بطوطۃ: شمس الدین ابی عبداللہ محمد بن عبداللہ اللواتی الطنجی، تحقیق: عبدالھادی التازی، اکادیمیۃ المملکۃ المغربیۃ، ۱۹۹۷ء۔ ۴۴۔۴۵

(۹) رحلۃ ابن بطوطۃ المسماۃ تحفۃ النظار فی غرائب الامصار وعجائب الاسفار، ابن بطوطۃ: شمس الدین ابی عبداللہ محمد بن عبداللہ اللواتی الطنجی، تحقیق: عبدالھادی التازی، اکادیمیۃ المملکۃ المغربیۃ، ۱۹۹۷ء۔ ۴۴۔۴۵

(۱۰) John ,Burnell.col.henry yule and A.C,hobson jobsonp.620 1903,Murray london

(۱۱) Swan ,Rebert Sewell,(Vijayanagar) A Forgotton Empire p46 1900,Co LondonSonnasnschein

(۱۲) تقویم البلدان، عمادالدین اسماعیل ابوالفدا، پیریس ۱۸۴۰ء ص ۳۵۴

(۱۳) hakluyt ,Mensel Longworth Dames,The Book of Duarte Barbosa 18/vol.1,1918,Society London

(۱۳) Kannada Research, S.D'sousa viktor,The Navayats of kanara p.47,1955, DharwarInistitute

(۳) عرب و دیار ہند، خواجہ بہاءالدین اکرمی ندوی، دارالسلام نوائط کالونی بھٹکل، ۱۹۸۰ء، ص ۲۰۰

۱۴۔ 347v.1,1945,Lisbon,Joa de Barros,Decadas 4Asia De

(۱۵) ,B.S.Shastry, 1763-Goa Kanara Portuguese Relations 1498 p.14,2000,New Delhi,Concept Publishing Company

(۱۵) Swan ,Rebert Sewell,(Vijayanagar) A Forgotton Empire p 99,1900,Co LondonSonnasnschein

(۱۶) ,B.S.Shastry, 1763-Goa Kanara Portuguese Relations 1498 p87,2000,New Delhi,Concept Publishing Company

&co W.H.Allen,Friderick Charls Danvers,The Portuguese in India .55960.pV.1,London 1894

اخبار علمیہ

''پاکستان کے دو پی ایچ ڈی مقالے''

اردو رسائل اور صحافت کی تاریخ پر پاکستان میں اس وقت وقیع کام ہو رہا ہے۔ اس سلسلہ میں ''رسالہ معارف کی اردو ادبی خدمات: ایک تحقیقی اور تنقیدی جائزہ'' کے نام سے عتیق احمد جیلانی اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، جامعہ سندھ اور ''پاک و ہند کے منتخب اردو اسلامی جرائد کی نمایاں خصوصیات اور بنیادی مناہج کا علمی و تجزیاتی مطالعہ'' کے عنوان سے سعید الرحمان اسسٹنٹ پروفیسر ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز عبدالولی خاں یونیورسٹی مردان، خیبر پختونخوا، پاکستان، کا پی ایچ ڈی مقالہ ہے یہ دونوں ہی غیر مطبوعہ ہیں تاہم نٹ پر اس کی پی ڈی ایف فائل موجود ہے۔ اول الذکر مقالہ کی نگراں ڈاکٹر نسیم آرا سر تاج پروفیسر وصدر شعبہ اردو جامعہ سندھ ہیں اور اس پر ۲۰۰۹ء میں مقالہ نگار کو ڈاکٹریٹ کی سند تفویض کی جا چکی ہے۔ فل اسکیپ سائز کے تقریباً ۴۰۰ صفحات پر مشتمل اس میں کل آٹھ ابواب ہیں اور آخر میں ایک صفحہ پر اس مفصل مقالہ کے نتائج اور ۵ صفحات میں مصادر و مراجع کی فہرست ہے۔ موضوع کا پس منظر اور تحقیقی طریق کار، دارالمصنّفین اور معارف، معارف کا تحقیقی سرمایہ، معارف کا تنقیدی سرمایہ، معارف کا سرمایۂ غالبیات، معارف کا سرمایہ اقبالیات، شذرات معارف اور متفرقات معارف (تبصرے، ادبیات، مکتوبات، وفیات) کے عناوین کے تحت معارف کی ادبی خدمات کا محققانہ و ناقدانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ تاہم بعض معلومات کے اندراج میں سہو ہو گیا ہے مثلاً معارف کی مجلس ادارت کے قیام کا مہینہ جولائی ۱۹۵۱ء درج ہے جو غلط ہے، صحیح اپریل ۱۹۵۱ء ہے۔ ثانی الذکر مقالہ کے نگراں مولانا ڈاکٹر سراج الاسلام حنیف، اسسٹنٹ پروفیسر ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز ہیں، یہ فل اسکیپ سائز کے پانچ سو چھپن صفحات پر محیط ہے۔ اس میں کل چھ ابواب ہیں۔ دوم کے علاوہ ہر باب میں پانچ فصلیں ہیں۔ باب دوم میں نو فصلیں ہیں اور ہر باب ایک مرکزی موضوع کا اور ہر فصل متعدد عناوین کا احاطہ کرتی ہے۔ باب اول ابلاغ و صحافت کا مفہوم، اقسام، ضرورت و اہمیت اور اسلامی ضوابط، باب دوم جملہ ممکنہ قدیم و جدید عالمی و مقامی اردو، مذہبی رسائل و جرائد کی تکنیکی درجہ بندی اور توضیحی فہرست پر مشتمل ہے (یہ باب اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں مجموعی طور پر ۲۲۰۰ جرائد کے تفصیلی و اشاعتی و ادارتی

کوائف معروضی انداز میں مندرج ہیں)، باب سوم منتخب اسلامی تحقیقی اردو جرائد کا تعارف، نمایاں خصوصیات اور بنیادی مناہج، باب چہارم منتخب دیوبندی اردو جرائد کا تعارف، نمایاں خصوصیات اور بنیادی مناہج، باب پنجم منتخب سلفی اردو جرائد کا تعارف، نمایاں خصوصیات اور بنیادی مناہج، باب ششم متفرق اردو اسلامی جرائد کا تعارف، نمایاں خصوصیات اور بنیادی مناہج جیسے مرکزی عناوین کے تحت منقسم ہے۔ آخر میں خلاصۂ بحث، نتائج بحث اور تجاویز وسفارشات، علمی وفنی فہارس یعنی آیات قرآنیہ، احادیث نبویہ، اعلام، بلاد واماکن، ادارہ جات، تنظیمیں، تحریکیں، مدارس وجامعات اور مصادر ومراجع کی فہرست اور ملحقات کے تحت تحقیقی سوال نامہ برائے مدیران جرائد درج کیے گئے ہیں۔ معارف کا ذکر باب سوم فصل اول کے تحت کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس میں بھی بعض معلومات سہواً غلط درج ہیں، مثلاً ص ۲۴۹ پر ناظم یا ڈائریکٹر کو دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا رفیق لکھا گیا ہے جو غلط ہے۔ دونوں مقالے جدید تحقیقی معیار واصول کے مطابق ہیں۔ ۳۰/نومبر ۲۰۱۵ء کو مقالہ نگار کو اس پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔

''نیویارک ٹائمز میں شائع ایک مشترکہ خط''

امریکہ کے ۳۵ ماہرین نفسیات کا ایک مشترکہ خط ۹/فروری کے نیویارک ٹائمز میں شائع ہوا ہے جس میں حال ہی میں منتخب امریکی صدر کو صدارت کے لیے نااہل اور ذہنی مریض کہا گیا ہے اور لکھا گیا ہے کہ وہ اپنے الفاظ اور طرز عمل دونوں سے ثابت کررہے ہیں کہ وہ دوسروں کے لیے ہمدردی نہیں رکھتے اور ان میں اختلاف رائے برداشت کرنے کی اہلیت بالکل نہیں ہے۔ جو نفسیاتی طور پر بیمار ہونے کی علامات میں شامل ہے۔ خط کے مطابق ۱۹۷۳ء میں امریکن سائیکیٹرک ایسوسی ایشن نے جو امریکی نفسیاتی معالجین کی سب سے بڑی انجمن ہے رضا کارانہ ''گولڈوائر رول'' کی پالیسی اور اصول کو منظور کیا تھا جس کا مطلب مشہور شخصیات کی دماغی حالت کے بارے میں خاموش رہنا ہے۔ اس وقت اسی پالیسی پر عمل کیا جارہا ہے لیکن اس نازک وقت پر کچھ نہ کہنا امریکہ کے لیے بدترین نقصان کی وجہ بن سکتا ہے۔ اسی لیے خط کے آخر میں امریکی صدر کو اس کی خردماغی کے سبب نااہل قرار دیا گیا ہے۔

(بحوالہ انقلاب، ۱۶/فروری ۲۰۱۷ء)

”نابینا افراد کے لیے بریل ٹیبلٹ کمپیوٹر“

بلیٹیب نامی ایک کمپنی نے اسی نام سے بریل سسٹم سے چلنے والا ایک ٹیبلٹ کمپیوٹر تیار کرلیا ہے۔اس کو پہلے مرحلہ میں ۳ہزار افراد پر کامیابی سے آزمایا گیا۔یہ ایک خاص نظام کے ذریعہ اسکرین پر موجود عام تحریر کو بریل کوڈ میں تبدیل کردیتا ہے جو اسکرین سے منسلک ”بریل بورڈ“ پر ابھاروں کی شکل میں نمودار ہوجاتی ہیں اور بینائی سے محروم افراد اسے مس کرکے پڑھ سکتے ہیں اور اسی بریل بورڈ کا استعمال کرکے اسے لکھ بھی سکتے ہیں۔یہ حروف ٹیبلٹ اسکرین پر عام حروف کی شکل میں نمودار ہوجاتے ہیں۔بینائی والے افراد اس تحریر کو دیکھ کر پڑھ بھی سکتے ہیں۔بلیٹیب میں آواز کے ذریعہ احکامات لینے کے علاوہ آواز کو تحریر اور تحریر کو آواز میں بدلنے کی سہولت بھی موجود ہے۔(تفصیل افکار ملی، فروری ۲۰۱۷ء میں دیکھی جاسکتی ہے)

”آن لائن قبول اسلام“

کویت کی جمعیت النجاۃ الخیریہ کے مطابق گذشتہ ایک سال میں الیکٹرانک دعوت کمیٹی کی مخلصانہ کوششوں کے نتیجہ میں ۴۴ ممالک سے تعلق رکھنے والے ۲۱۰ افراد حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔اس سے وابستہ ایک ذمہ دار ڈاکٹر جمال الشطی کا کہنا ہے کہ ہمارا منصوبہ ایسے افراد سے ربط پیدا کرنا ہوتا ہے جو اسلامی تعلیمات و ہدایات سے واقف ہونے کی خواہش رکھتے ہیں۔مبلغین ان کو اسلام کی حقانیت سے واقف اور ان کے ذہنوں میں اسلام سے متعلق پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کا ازالہ کرتے ہیں۔رپورٹ کے مطابق گذشتہ برس ۲۲۸۴ لوگوں سے رابطہ کیا گیا جن میں ۲۱۰ افراد پوری تحقیق اور اطمینان کے بعد دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ڈاکٹر الشطی کا کہنا ہے کہ اسلام آن لائن سروس کا قیام دو برس قبل عمل میں لایا گیا تھا۔اس شعبہ میں دنیا کی مختلف زبانیں سمجھنے اور بولنے والوں اور مختلف ممالک اور ان کی تہذیبوں اور مقامی مذاہب سے واقفیت رکھنے والوں کا تقرر کیا گیا تھا تاکہ اسلام سے دلچسپی رکھنے والوں کو ان کی اپنی زبانوں میں اسلام کو سمجھایا جاسکے۔(صراط مستقیم، برمنگھم، جنوری ۲۰۱۷ء)

ک،ص اصلاحی

آثار علمیہ وتاریخیہ

مولانا عبدالماجد دریابادی کے خطوط ڈاکٹر سید سلمان ندوی کے نام

(۲)

(۴)

دریاباد
۱۸؍فروری ۱۹۶۵ء

عزیزی سلمہ اللہ۔ وعلیکم السلام

خیریت نامہ خوب مفصل ماشاءاللہ عرصہ ہوا مل گیا تھا، جواب آج کل پر ٹلتا رہا۔کوئی بات عجلت والی بھی نہیں تھی۔خط کا بیشتر حصہ صدق کے قابل تھا۔ٹکڑے ٹکڑے کرکے دوتین نمبروں میں دے دیا۔ کالے مسلمان وغیرہا۔جون ۶۶ء تک واپسی کی خبر سے کچھ تو تسلی ہوئی۔حالانکہ تعلق والوں کو اتنی مدت بھی پہاڑ معلوم ہوگی اور والدہ بے چاری تو ایک ایک دن گن گن کر کاٹ رہی ہوں گی۔(۱)

کل ۱۹؍کو انشاءاللہ عزم اعظم گڑھ ہے۔جشن طلائی ۲۰۔۲۱؍کو ہے۔ڈاکٹر ذاکرحسین کی صدارت میں اور بھی بہت سے لوگ آرہے ہیں، منسٹر وغیرہ۔جمال میاں فرنگی محلی، مولانا عمران خاں وغیرہ کے ذریعہ چندہ خوب وصول ہوگیا۔دھوم دھام رہے گی۔(۲)

میں نے ایک مقالہ ۲۰۔۲۵ منٹ میں پڑھنے والا تیار کرلیا ہے عنوان ''شبلی: انسان، مصنف، مصنف گر'' لیکن زیادہ بڑے مجمع کے سامنے سناتے گھبراتا ہوں۔آواز کام نہیں دیتی، کوشش کروں گا کہ نوبت ہی پڑھنے کی نہ آئے، کوئی دوسرا اسے پڑھ ہی نہیں سکتا تاوقتیکہ میرے سامنے دو ایک بار مشق نہ کرے۔(۳)

مکتوبات حصہ دوم کو پریس میں گئے کئی مہینے ہوچکے ہیں۔اصل سوال جیب کا ہے۔۹۰۰اور ۱۰۰۰ کے درمیان لاگت آرہی ہے۔ذرا جیب گرم ہوتو پریس سے تقاضہ کروں۔(۴)

حصہ اول پر انجام وغیرہ نے تبصرے بہت اچھے کیے تھے اور کتاب خوب نکلی۔مخالفت کا رقبہ بہت ہی محدود رہا اور مخالفین میں ایک نمایاں نام مولوی نجیب اشرف کا ہے۔زخاک مکہ ابوجہل !..(۵)

اور کوئی بات خیال میں نہیں آتی۔خیریت نامہ کا برابر انتظار کرتا رہوں گا۔ والسلام

دعا گوو دعا خواہ

(مولانا) عبدالماجد

---

(۱) امریکہ میں کالے مسلمانوں کا (Negro) ذکر کیا ہوگا۔دو قسم کے مسلمان تھے ایک وہ تھے جو صحیح طور پر تھے اور ایک تھے جو ایک دعوے دار نبوت عالیجا محمدؐ کے پیروکار تھے بعد میں ان کے انتقال کے بعد صحیح اسلام کی طرف آ گئے تھے۔(۲) دارالمصنّفین کی طلائی جوبلی کا ذکر ہے۔اس میں اشخاص کے ناموں کا ذکر ہے۔(۳) مولانا کے مضمون کا عنوان: شبلی انسان، مصنف مصنف گر۔(۴) مکتوبات سلیمانی جلد دوم کی اشاعت کی خوش خبری۔(۵) مکتوبات کی پذیرائی عام پر مسرت کا اظہار اور نجیب اشرف صاحب کی معاندانہ تحریر پر افسوس۔اصل شعر یہ ہے

حسن ز بصرہ بلال از حبش صہیب از روم　　ز خاک مکہ ابو جہل ایں چہ بوالعجبی ست

مولانا کو اس کی خاصی تکلیف تھی۔

(۵)

دریاباد، بارہ بنکی

۱۲رفروری ۱۹۶۹ء

عزیزم　وعلیکم السلام

مکتوب مہینوں کے نہیں برسوں کے بعد ملا، ایک مدت کے انتظار کے بعد اب تو مایوس ہی ہوگیا تھا۔ مرحومہ کے ساتھ محبت ہی نہ تھی جیسی عموماً شوہروں کو ہوتی ہے بلکہ عشق تھا جس کی مثال کم دیکھنے میں آتی ہے۔بیماری مختصر ہی میں سمجھ رہا تھا اور اس کے لیے تیار بھی رہتا تھا۔لیکن اس حیرت انگیز حد تک اچانک میرے خیال میں بھی نہ تھی۔(۱)

اپنے بھائی (شیخ مسعودالرحمٰن مرحوم) کی پوتیوں کی شادی میں خوش خوش بڑے چاؤ کے ساتھ میکے (باندہ) گئی ہوئی تھیں (۲) اور منگل کی سہ پہر کو انہیں ہنسی خوشی چھوڑ کر واپس آ گیا۔ ۳۲ گھنٹہ بعد بدھ کو رات میں کل چند منٹ کے تنفس کے بعد خود رخصت ہو گئیں۔ تار اور ٹیلی فون کی مسلسل کوششوں کے بعد ۱۱ گھنٹے مجھے خبر پہنچنے میں لگ گئے، کن مصیبتوں سے جمعرات کو رات میں پہنچ پایا، کفن پوش چہرہ کی زیارت نصیب ہو گئی۔ (۳)

"بوڑھی محبوبہ" کے عنوان سے دو نمبروں میں دردِ دل لکھ دیا ہے (۴)۔ پرچے دفتر سے پہنچیں گے۔
بہرحال مشیت الٰہی پوری ہونی ہی تھی۔ اس دن سے آج ۴۰ دن ہو چکے ہیں ہنسی ایک بار بھی نہیں آسکی

دیر میں یا حرم میں گزرے گی عمر اب تیرے غم میں گزرے گی

مدت قیام اور وقت واپسی وغیرہ کی تفصیل کا منتظر رہوں گا۔

والسلام

دعا گو

(مولانا) عبدالماجد

---

(۱) مولانا کا اپنی اہلیہ مرحومہ کے انتقال پر شدید تاثر کا اظہار۔ (۲) اہلیہ کا انتقال دریاباد سے دور باندہ میں اپنے بھائی کے یہاں ہوا تھا۔ (۳) کفن پوش چہرہ کا جملہ ہی مولانا کے شدید رنج کا اظہار ہے یہ صحیح ہے کہ مولانا کو مرحومہ سے عشق تھا۔ (۴) مولانا نے صدق میں "بوڑھی محبوبہ" کے نام سے اپنے غم کا اظہار کیا تھا۔

(۶)

دریاباد، بارہ بنکی

۱۸/ستمبر ۱۹۷۲ء

عزیزم سلمہ۔ السلام علیکم

آں عزیز کی توجہ کے طفیل میں آخر مسلم ورلڈ آنا شروع ہو گیا۔ ہر طرف کوشش کر کے تھک چکا تھا۔ ابھی تو پہلا نمبر آیا ہے جنوری ۷۲ء۔ (۱)

بیرونی کتابوں کا قحط ایسا یہاں پڑ گیا ہے کہ کیا بیان ہو۔ غیر معمولی گرانی تو ظاہر ہی ہے۔ ساتھ

ہی نایابی بھی! اور پاکستان سے تو مراسلت کی کوئی صورت ہی نہیں! مدتوں سے یہی حال چلا آرہا ہے۔ چند سال پہلے کون اس صورت حال کا خیال کرسکتا تھا؟

والدہ صاحبہ تو کراچی میں انشاءاللہ بدستور و بخیریت ہوں گی۔ یہاں سید حسین ابھی تک آگرہ میں اڈیشنل کمشنر تھے۔ اس ہفتہ کہیں تبادلہ ہوا ہے غالباً فیض آباد میں۔(۲)

میاں غلام محمد اور اشرف خان پشاوری کبھی کبھی بڑے چکر دار راستوں سے خط بھیجنے کا ارمان نکال لیتے ہیں۔(۳) ع جیسی اب ہے تیری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

ہاں کیا نیشنلٹی امریکا کی لے لی ہے کئی سال مستقل قیام کے وہاں ہو گئے۔ والدہ کو دیکھنے کا جی نہ چاہتا ہوگا؟(۴)

کے بچے ماشاءاللہ ہیں؟ علمی منزلیں کیا کیا طے کیں؟(۵)

حیات سلیمان، شاہ معین الدین خدا خدا کرکے بڑی حد تک پوری کر چکے ہیں۔ کچھ حصہ اب بھی باقی ہے۔ مسودہ میرے پاس آتا رہتا ہے۔(٦)

اگر نیشنلٹی امریکی ہوچکی ہے تو ہندوستان آنا تو نسبتاً آسان ہوگا۔ دیسنہ، لکھنؤ اور فیض آباد وغیرہ سب کا گشت ہوسکتا ہے۔

یہ واشنگٹن کے اسلامک سنٹر کے صدر ڈاکٹر عبدالرؤف کون شخص ہیں، کہاں کے ہیں، کیا کرتے یا کیا پڑھتے ہیں؟(۷)

ہاں اپنی ذاتی غرض کو ابھی تک زبان پر لایا نہیں۔ مسلم ورلڈ کی دستیابی نے پیاس بجھائی نہیں کہیں زائد بڑھادی ہے، اس نمبر میں تین کتابوں کے نام ایسے دیکھے جن کے لیے دل بے قرار ہے۔

1- Pike, E-Royston: Mohammad, Prophet of the Religion of Islam, 1969. New York.

2- Smith, S Byron P. Islam in Engilsh Literature (PUB, PR145 564) Beirut Amrican Press, 1935.

3- Daniel, Islam and the West, University Press, Edinburgh. 1960.

میں پہلے ہی اتنا شرمندہ ہوں کہ آگے ہمت زبان کھولنے کی پڑتی نہیں۔ بہرحال تینوں میں جو کتاب بھی (سیکنڈ ہینڈ بھی کوئی مضائقہ نہیں) میسر آسکے، اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔ قیمت اور اس کی ادائی کے طریقے جو چاہو بے تکلف لکھ بھیجو۔

یہاں تو غالباً ۵۹ء میں آئے تھے۔ ۱۳ر برس دیکھے ہوئے ہوگئے۔ والسلام

دعا گو

(مولانا) عبدالماجد

---

(۱) مولانا کو امریکی رسالہ مسلم ورلڈ جو Heartfort Seminary سے شائع ہوتا تھا تلاش تھی، میں نے اس جرنل کو مولانا کے نام جاری کروایا دیا تھا۔ اس میں اکثر اسلام کے خلاف ناقدانہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ (۲) میری والدہ ماجدہ کراچی میں تھیں۔ میرے بہنوئی سید حسین صاحب کا ذکر ہے کہ ان کا تبادلہ آگرہ سے کہیں اور ہوگیا ہے۔ (۳) والد ماجدؒ سے غلام محمد صاحب حیدرآبادی جن کی تصنیف تذکرہ سلیمان ہے اور محمد اشرف صاحب پشاوری جنھوں نے سلوک سلیمانی کے نام سے تین جلدوں میں شائع کی ہے۔ دونوں حضرات والد ماجد سے بیعت تھے۔ (۴) مولانا کو خیال تھا کہ شاید میں نے امریکی قومیت لے لی ہے، مگر یہ صحیح نہیں۔ (۵) میرے بچوں کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ میرا ایک بیٹا جو دماغ کا سرجن ہے، جنوبی افریقہ میں ہے، جہاں میری رہائش ہے اور ایک بیٹی پیتھالوجی کی اسپیشلسٹ ہے۔ بیٹے کا نام سید سمیر اور بیٹی کا نام شیماء سلطانہ ہے۔ (۶) ڈاکٹر عبدالرؤف واشنگٹن کے اسلامک سینٹر کے ڈائریکٹر تھے، بڑے نفیس اور خداترس مصری تھے۔ (۷) حسب ذیل کتابوں کی تلاش تھی اس کی فرمائش کی تھی:

1- Pike, E-Royston: Mohammad, Prophet of the Religion of Islam.

2- Smith, Byron P. Islam in Engilsh Literature.

3- Daniel, Norman, Islam and the West.

یہ ساری ہی کتابیں میں نے مولانا کو بھجوادی تھیں اس کی رسید مجھے اس وقت جنوبی افریقہ میں ملی جب میں دسمبر ۱۹۷۳ء میں جنوبی افریقہ منتقل ہوگیا، جہاں میں نے دراسات اسلامیہ کا شعبہ ایک یونیورسٹی میں قائم کیا تھا۔ (۸) مولانا کا خیال صحیح تھا، جنوبی افریقہ سے اس وقت ہندوستان جانے میں مشکلات تھیں، مولانا سے خط و کتابت رہی مگر افسوس ہے کہ خطوط انتقال مکانی میں گم ہوگئے جس کا افسوس رہا۔

(۷)

۲۰/ اگست ۱۹۷۳ء

عزیزم سلمہ اللہ۔ وعلیکم السلام

خیریت نامہ عرصہ کے بعد ملا، لیکن خوب ملا، دیر آید درست آید اسی کو کہتے ہیں۔

کتابوں کا تحفہ نورٌ علی نور، Pike والی کتاب سیرت پاک پر خصوصاً میرے کام کی نکلی۔(۱) اور پھر سارا قیمتی سودا گویا مفت ہی ملا۔ جزاک اللہ خیر الجزاء کے سوا اور کیا کہوں۔ سلیمان زادہ سے توقع بھی یہی تھی۔(۲)

ڈربن یونیورسٹی میں آجانے کی خبر سے بھی خوشی ہوئی۔ محبت نامہ کے حوالہ سے (نام لائے ہوئے بغیر) صدقؔ میں دو نوٹ دے رہا ہوں۔(۳)

حیات سلیمانی اس وقت تک تو نکلی نہیں، انشاءاللہ اسی ہفتہ عشرہ میں نکل آنے کی توقع ہے۔(۴)

یہ بہت اچھا کیا کہ اپنی والدہ ماجدہ کو آکر دیکھ گئے۔ اور یہ بھی بہت اچھا کیا کہ ان کی اور میاں غلام محمد، دونوں کی خیریت لکھ بھیجی۔(۵)

آج بڑا اہم دن ہے، ہندو پاکستان کی کانفرنس دہلی میں ہو رہی ہے۔ اللہ اب بھی فریقین کی سمجھ درست کر دے تو بڑی بات ہے۔

ہاں اپنی اولاد کا حال کچھ بھی نہ لکھا، ماشاءاللہ کے بچے ہیں؟(۶)

حافظ اشرف خان نے افغانستان کے واسطہ سے ایک راستہ مراسلت کا نکال لیا ہے۔(۷)

مولانا عبدالباری بے چارے بہت زیادہ علیل رہنے لگے ہیں اور بری بات یہ کہ نسیان حد سے بڑھ گیا ہے، ابھی بات کہی اور ابھی بھول گئے۔(۸)

اپنی قومیت ابھی تک تو پاکستان ہی کی رکھی ہے نہ؟ امریکا کی تو نہیں کرلی؟(۹)

علی میاں مدت سے ممالک اسلامی کے دورہ پر ہیں، آج ہی کل میں واپسی کا پروگرام ہے۔(۱۰)

مقالہ ''عبداللہ بن زبیرؓ'' کے چھپنے کا انتظار رہے گا (۱۱) اور اس انگریزی کتاب Smith's Byron Islam in English Literature کا اشتیاق تو باقی ہی ہے۔ جب بھی

اس کا پورا ہونا ممکن ہو۔(۱۲)

کیا انٹرنیشنل پاسپورٹ پر ہندوستان کی آمد کبھی ممکن نہیں؟

میاں سید حسین تو فیض آباد میں کمشنر ہیں، اب ماشاء اللہ حاجی بھی ہو گئے ہیں۔(۱۳)

والسلام دعا گو و دعا خواہ

(مولانا) عبدالماجد

---

(۱) یہ ان کتابوں کا ذکر ہے جن کا حوالہ ۱۸ر ستمبر ۱۹۷۳ء میں ذکر ہے، یہ کتابیں مولانا کو ارسال کردی تھیں، اس خط میں Pike کی کتاب Mohammad the Prophet of the Religion of Islam کے متعلق ذکر ہے کہ مولانا کے کام کی ہے۔(۲) ہدیہ کے طور پر ارسال کی تھی اس کا شکریہ ہے۔(۳) جنوبی افریقہ کی ڈربن یونیورسٹی سے دعوت دی گئی تھی کہ وہاں اسلامیات کا شعبہ اور عربی اردو و فارسی شعبہ بحیثیت پروفیسر اور صدر شعبہ اسلامیات قائم کروں۔(۴) شاہ معین الدین ندوی صاحب ناظم دارالمصنّفین میرے والد ماجدؒ کی حیات ''حیات سلیمان'' کے ساتھ ترتیب دے رہے تھے، اسی کا تذکرہ ہے۔(۵) جنوبی افریقہ جانے سے پہلے میں کراچی جا کر والدہ ماجدہ سے ملنے گیا تھا، غلام محمد صاحب مصنف تذکرہ سلیمان کا ذکر ہے، ان کا عرصہ ہوا انتقال ہو گیا۔(۶) مولانا نے میرے بچوں کا دوبارہ سوال کیا تھا، میرا ایک لڑکا سید سمیر دماغ کا سرجن ہے اور ۱۹۷۳ء میں تو وہ دس برس کا تھا، میری ایک بیٹی شیما سلطانہ جو پیتھالوجی کی اسپیشلسٹ ہے، اس وقت پانچ برس کی تھی۔ دونوں ہی جنوبی افریقہ میں ہیں۔(۷) محمد اشرف صاحب پشاوری مصنف سلوک سلیمانی کا ذکر ہے، کئی سال ہوئے ان کا انتقال ہو گیا۔(۸) مولانا عبدالباری ندوی کا ذکر ہے۔(۹) مولانا کو فکر تھی کہ کیا میں نے امریکہ کی قومیت تو نہیں لی، میں نے امریکی قومیت نہیں لی، لے سکتا تھا مگر دل نہ چاہا۔(۱۰) سیدی الاستاذ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا ذکر ہے۔(۱۱) میرا پی ایچ ڈی کا مقالہ، عبداللہ بن زبیرؓ اور مسئلہ خلافت پر تھا، میں نے ایک فوٹو کاپی بعد میں ارسال کردی تھی۔(۱۲) غالباً اس وقت کی Byron Smith's کی کتاب Islam in English Literature اور مطلوبہ کتابوں کے ساتھ نہیں دستیاب تھی شاید اسی لیے نہیں بھیجا تھا، اسی کتاب کا ذکر ہے۔(۱۳) میرے بہنوئی سید حسین صاحب مرحوم کا ذکر ہے، وہ اس وقت غالباً فیض آباد میں کمشنر تھے اور حج مکمل کر کے واپس آئے تھے۔

معارف کی ڈاک

حمزہ کی قراءت اور ایک سوال کا جواب

۲۲ر فروری ۲۰۱۷ء
اعظم گڑھ

محترمی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

۱۔ گذشتہ اکتوبر کے شمارے میں ایک مضمون ''امام ابوالحسن کرخی کا اصول اور غلط فہمیوں کا جواب'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس میں ص ۲۰۴ پر فاضل مضمون نگار حمزہ بن حبیب الزیات (۸۰-۱۵۶ھ) کی قراءت کے بارے میں مشہور محدث عبدالرحمٰن بن مہدی (ف ۱۹۸ھ) کا ایک قول نقل کرنے کے بعد اس کے جواب میں رقم طراز ہیں:

''آج امت مسلمہ کا بڑا طبقہ بلکہ اگر اس کو ۹۵ فیصد بھی کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ حمزہ کی قرأت پر ہی قرآن پاک کی تلاوت کرتا ہے اور اسی کو اللہ پاک نے قبول عام بخشا ہے''۔

راقم عرض کرتا ہے کہ حمزہ کی قراءت جسے ۹۵ فیصد کی قراءت بتایا گیا ہے اس کا رواج صدیوں پہلے ختم ہوگیا تھا اور وہ اب کہیں بھی رائج نہیں۔ مسلمانوں کی غالب اکثریت جس میں خود مضمون نگار بھی شامل ہیں عاصم بن ابی النجود (ف ۱۲۷ھ) کی قراءت کے مطابق قرآن مجید کی تلاوت کرتی ہے۔

۲۔ دسمبر کے شمارے میں میرے مضمون ''تاریخ نوائط۔ بعض مسائل'' کی پہلی قسط چھپی تھی۔ شاہ ظفر الیقین صاحب کو اس میں ایک جگہ تضاد نظر آیا جس کی جانب انہوں نے فروری کے تازہ شمارے میں توجہ دلائی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ص ۴۴۸ پر لکھا ہے کہ ''تیسرے بھائی مالک کے دو بیٹے تھے فہر اور حارث، حارث کے کوئی اولاد نہیں تھی''۔ جب کہ اس سے پہلے ص ۴۴۶ اور ۴۴۷ پر عربی اور اس کے ترجمے میں ''عمرو بن الحارث بن مالک'' لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حارث لاولد نہیں تھا۔ سوال یہ ہے کہ دونوں میں سے کون سی بات صحیح ہے؟

جواباً عرض ہے کہ دونوں باتیں اپنی جگہ درست ہیں، ص ۳۴۶ اور ص ۳۴۷ پر حارث بن مالک بن نضر بن کنانہ کا ذکر ہے اور ص ۳۴۸ پر حارث بن مالک بن کنانہ کا، یہ چچا ہے اور سابق الذکر بھتیجا۔ ص ۳۴۶ اور ص ۳۴۷ پر مصعب الزبیری، بلاذری اور طبری تینوں کے اقتباسات میں ''عمرو بن الحارث بن مالک بن کنانہ'' لکھا ہے۔ یہ ''بن کنانہ'' کا اضافہ اسی لیے کیا گیا ہے کہ قاری کو اشتباہ نہ ہو، متقدمین کسی لفظ کا استعمال بلاضرورت نہیں کرتے تھے۔ شاہ ظفر الیقین صاحب نے اپنے مراسلے میں اسی اضافے کو زائد سمجھ کر حذف کر دیا جس میں ان کے سوال کا جواب پوشیدہ تھا۔ سیاق وسباق کے علاوہ شاہ صاحب نے اگر اس پر غور کیا ہوتا کہ تینوں مصنّفین کو ''بن کنانہ'' کے اضافے پر اصرار کیوں ہے تو ان کی الجھن دور ہو جاتی۔

والسلام

(جناب) محمد اجمل اصلاحی

غالب کا پہلا دیوان

۳۰/۱/۲۰۱۷ء

مدینہ منزل، علی گڑھ

محترم مدیر معارف السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معارف کا جنوری ۲۰۱۷ء کا شمارہ ملا۔ اس میں جناب انوار صدانی کا مکتوب شائع ہوا ہے۔ ان کے والد توفیق احمد قادری نے پہلی بار غالبؔ کا پہلا دیوان بہ خط غالب دریافت کیا اور اس کا علم کسی کو نہیں تھا۔ مولانا عبدالسلام ندویؒ نے جس نسخہ کا ذکر فرمایا تھا وہ نسخہ حمیدیہ تھا جو نواب حمید اللہ والی ریاست بھوپال کے کتب خانہ میں ۱۹۴۷ء تک موجود تھا۔ ۱۹۴۷ء میں انضمام ریاست کے ہنگامہ میں ان نادر مخطوطات کی الماری غائب ہو گئی جس میں حضرت نواب صاحب نے غالب کا یہ نادر دیوان رکھا تھا۔ نسخہ حمیدیہ سے مولانا امتیاز علی عرشی بھوپال سے نسخہ حمیدیہ کی جو نقل لائے تھے وہ نسخہ عرشی کہلاتا ہے۔ یہ نسخہ پورا نقل نہ ہو پایا تھا۔ اسی نسخہ کو سامنے رکھ کر پروفیسر نثار احمد فاروقی نے نسخہ امروہہ کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ اب غالب کے غیر منتخب اور پورے کلام کے دو نسخے اس وقت موجود ہیں:

نسخہ امروہہ جس کو نثار احمد فاروقی نے پاکستان سے شائع کر دیا ہے وہ ۱۸۱۶ء کا لکھا ہوا ہے اور

بہ خط غالب ہے۔اس نسخہ پر پروفیسر نثار احمد فاروقی نے محنت کر کے غالب کے شکستہ خط کو صاف کر کے نستعلیق خط میں نقل کیا ہے۔ایک طرف خط غالب میں پورا دیوان شائع ہوا ہے اور اس کے سامنے پروفیسر نثار احمد صاحب کا صاف کردہ نسخہ ہے۔اس لیے کہ فاروقی صاحب مخطوطات کو پڑھنے میں ممتاز تھے۔اس نودریافت نسخہ پر انہوں نے ۴۰ صفحات پر مشتمل عالمانہ مقدمہ لکھا ہے۔اس لیے محترم انوار صمدانی صاحب کا بیان صحیح ہے کہ اس سے قبل کسی کو اس نسخۂ امروہہ کا علم نہ تھا۔

نسخہ حمیدیہ کو مولانا عبدالسلام ندویؒ نے دیکھا تھا اور اس کو عرشی صاحب نے عجلت میں نقل کیا تھا۔اس نسخہ سے نثار صاحب نے نسخہ امروہہ کا مقابلہ کیا ہے مگر اس وقت اصل نسخہ حمیدیہ غائب ہو چکا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں وہ لاپتہ ہو گیا تھا۔اب اکتوبر ۲۰۱۵ء میں وہ نسخہ دریافت ہوا۔ پہلے وہ لندن پہنچا وہاں سے امریکہ پہنچا۔امریکہ سے اس کی ڈیجیٹل کاپی فروخت ہو رہی ہے۔یہ نسخہ حمیدیہ ۱۸۲۱ء کا تحریر کردہ ہے اور اس کو حافظ معین الدین خطاط نے ۱۸۲۱ء میں نقل کیا ہے۔یہ بہ خط غالب نہیں ہے مگر نسخہ امروہہ کی فضیلت یہ ہے کہ وہ بہ خط غالب ہے اور نسخہ حمیدیہ سے قبل کا لکھا ہوا ہے۔یہ دونوں نسخے غالب کے متداول دیوان سے قبل کے ہیں اور مکمل ہیں۔ان دونوں کی خوبی یہ ہے کہ وہ انتخاب کلام سے قبل کے ہیں۔ان میں کلام غالب کا حذف شدہ کلام بھی شامل ہے اور نسخہ امروہہ میں غالب کی ۱۹ غیر مطبوعہ غزلیں اور تیرہ رباعیات فارسی شامل ہیں۔گیارہ رباعیات اردو بھی ہیں۔ پروفیسر نثار صاحب نے تیرہ فارسی اور گیارہ اردو رباعیات کی فہرست دے دی ہے۔ ۱۳ فارسی رباعیات نسخہ حمیدیہ میں موجود ہیں۔اس طرح انیس غزلیں اور گیارہ اردو رباعیات نسخہ امروہہ میں مزید ہیں جو نسخہ حمیدیہ میں مفقود ہیں۔اس پوری بحث کے لیے ملاحظہ فرمایئے،نقوش کا غالب نمبر حصہ دوم، مطبوعہ جولائی ۱۹۸۴ء،ص ۹ تا ۴۸۔

نودریافت نسخہ حمیدیہ ورجینیا یونیورسٹی،امریکہ(نسخہ حمیدیہ کی ڈیجیٹل کاپی اکتوبر ۲۰۱۵ء)(۱) میں پروفیسر ظفر احمد صدیقی کا ممنون ہوں کہ دونوں نسخے انہوں نے مجھے عطا فرمائے،جن کی مدد سے میں نے یہ مواد حاصل کیا۔نسخۂ امروہہ میں غالب کا تخلص اسدؔ ہے،غالب نہیں۔ والسلام

(جناب) سید احتشام احمد ندوی

---

(۱) یہ دیوان ڈاکٹر مہر افشاں کے مبسوط مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا ہے۔(معارف)

ادبیات

غزل

جناب محمد طارق غازی*

تم کہاں، تمرین روز افزوں کہاں — حاصل شب گیسوئے شبگوں کہاں
بے فراست، بے نظر، بے دست و پا — میں تری دنیا کے قابل ہوں کہاں
دشت لا حاصل ہے اب جان حزیں — اب یہاں مستق کہاں مجنوں کہاں
تھامے پھرتا ہے کدو فرعون آج — مصر میں ہاماں نہیں، قاروں کہاں
اس خرابے میں خموشی بس گئی — جان محزوں میں دل محزوں کہاں
دوستوں نے نذر دشمن کردیا — اب رگ جاں میں ہماری خوں کہاں
ہر فسانے میں کہاں افراسیاب — ہر پٹارے میں یہاں افسوں کہاں
آدمی ہے اب فقط زخم زمیں — گم ہوا وہ نسخۂ گردوں کہاں؟
مختلف دشت بلائے نجد ہے — غول پھرتے ہیں وہاں مجنوں کہاں
اس کی مرضی پر جھکا دے اپنا سر — اس کی مرضی میں چرا و چوں کہاں
مجمع البحرین پر کوئی نہیں — یا الٰہی اس کو اب ڈھونڈوں کہاں
وہ کہ دلی جس سے تھی ممتاز کل — اندروں باقی نہیں، بیروں کہاں
جن کے پیروں میں ہے زنجیرِ زمیں — ان کے ذہنوں میں بھلا گردوں کہاں
کیسا صدیوں میں اندھیرا بھر گیا — یہ شب غم تو بتا کاٹوں کہاں
رہ گئی بنجر زمیں پھر خشک چشم — ابر بھی پوچھا کیا برسوں کہاں
گندی دھرتی، گدلی جھیلیں، تال سب — دور تجھ سے اے زمیں بھاگوں کہاں
ایسے شعروں سے بھی کچھ حاصل نہیں — پھر طبیعت بھی تری موزوں کہاں
ہے متاع شرم عصیاں ایک اشک — ورنہ طارقؔ تم کہاں جیحوں کہاں

غزل

(حضرت جگر مرادآبادی مرحوم کی یاد میں)

جناب وارث ریاضی**

ان کی آنکھوں نے پلا کے کیفِ رندانہ مجھے — کردیا دنیائے رنگ و بو سے بے گانہ مجھے

---

* ڈائریکٹر امم اسٹڈیز ہاؤس (USH) ٹورانٹو، کنیڈا۔

** کاشانۂ ادب، سکٹا، پوسٹ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن ۸۴۵۴۵۳ (بہار)۔ Mob:0091-8986132474

باوجود انقطاعِ رسم و راہِ آرزو
جانے کیوں کہتی ہے دنیا ان کا دیوانہ مجھے؟

میں جو کہتا ہوں سنائیں: اپنی رنگیں داستاں
وہ سنا دیتے ہیں میرے غم کا افسانہ مجھے

زندگی بھر کی وفا کے بعد بھی دینا پڑا
ان کی بزمِ تمکنت میں دل کا نذرانہ مجھے

جب بھی آتا ہے زباں پر ذکر انجام وفا
یاد آجاتے ہیں وہ بے اختیارانہ مجھے

جب سے صحرا کو بسایا ہے جنونِ عشق میں
رشک گل زار جناں لگتا ہے ویرانہ مجھے

میرے احوال زبوں پر جن کو آتی تھی ہنسی
دیکھتے ہیں وہ بہ چشمِ احتیاجانہ مجھے

عشق میں پیہم مری ناکامیوں کے فیض سے
مل گیا یک سر مزاج انکسارانہ مجھے

میرے ترک مے کشی کے سوگ میں ساقی مرے
"مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے"(ا)

میں تو ہوں وارثؔ ریاضی عازمِ کعبہ مگر
کھینچتا ہے اپنی جانب حسنِ بت خانہ مجھے

غزل

جناب محمد امین احسن*

اب اس کی ذات سے ہم اختلاف کیا کرتے
جو مل گیا تھا تو پھر اعتکاف کیا کرتے

نگاہ حسن کا مسکت جواب کافی تھا
سرک گئی تھی ردا، انکشاف کیا کرتے

تمام عمر پس پشت ڈال رکھا تھا
حریر و دیبا کے عمدہ غلاف کیا کرتے

بہت خموش تھا، چہرے پہ بھی ندامت تھی
غرور یار کو اب واشگاف کیا کرتے

جو اپنی جیب میں سارا زمانہ رکھتا تھا
ثبوت پختہ بھی اس کے خلاف کیا کرتے

تلاش تیری تھی، اپنا جنون رہبر تھا
یہ برق و رعد، یہ صحرا، جفاف کیا کرتے

کہاں کسی میں یہ جرأت تھی باز پرس کرے
وہ سنگ خارا تھا، اس میں شگاف کیا کرتے

سلوک بے جا سے ناراض سارے پروانے
چراغ جاناں کا ہنس کر طواف کیا کرتے

تھی جس کے دم سے زبان وادب کی شان امینؔ
حضور اس کے بھلا شین کاف کیا کرتے

(ا) حضرت جگر مرادآبادی کی ایک مشہور غزل کا مصرع۔

* بلریا گنج، اعظم گڑھ۔

مطبوعات جدیدہ

مقالات ابوالمآثر جلد سوم: از مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ، مرتب ڈاکٹر مسعود الاعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۹۶، قیمت ۱۶۴ روپے، پتہ: مدرسہ مرقاۃ العلوم، پٹھان ٹولہ مئوناتھ بھنجن، یوپی اور مئو کے دیگر مکتبے۔

محدث کبیر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کے مقالات کا یہ تیسرا حصہ ہے۔ مولانا کی ہر تحریر دیدہ ریزی اور دقت نظر کی خوبیوں کا نمونہ کہی گئی۔ اس مجموعہ میں ستائیس مضامین ہیں اور قریب قریب ہر مضمون کسی بحث کی تنقید و توضیح ہے، مثلاً پہلی ہی تحریر تاج التراجم فی تفسیر القرآن للاعاجم کے عنوان سے ہے۔ قاضی اطہر مبارک پوری نے صدق جدید میں اس کتاب کے مصنف کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ یہ ابوبکر بن محمد خراسانی ہیں، مولانا اعظمی کی تحقیق میں یہ امام شاہفور بن طاہر اسفرائنی ہیں، لیکن مولانا کے ذوق تحقیق نے تاج التراجم کے متعلق دوسری معلومات کے بند دروازے بھی کھول دیے اور چار صفحات میں گویا ایک خزانہ سامنے آگیا، قاضی اطہر مبارک پوری ہی کے تعلق سے کچھ اور بھی تحریریں مثلاً الذخائر والتحف، ہندوستان میں علم حدیث، رجال السند والہند وغیرہ ہیں اور مشاہیر جیسے مولانا گیلانی، ڈاکٹر مصطفٰی حسن علوی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، مولانا ابراہیم سیالکوٹی، پروفیسر خلیق احمد نظامی، مولانا سید محمد میاں دیوبندی اور ڈاکٹر حمید اللہ کے بعض مباحث کے سلسلہ میں تنقید و تصحیح کا یہی کمال نظر آتا ہے۔ مولانا اعظمی، مولانا سید سلیمان ندوی کے والہ و شیدا تھے۔ یہ شیفتگی کس درجہ تھی، اس کا اندازہ ان کے ان حزینہ جذبات سے کیا جاسکتا ہے جو اشعار میں ڈھل گئے، سیرۃ النبی جلد اول و دوم کے مطالعہ کے دوران مولانا اعظمی کو بعض مقامات سے اطمینان نہیں ہوا تو انہوں نے سید صاحب کی خدمت میں معروضات پیش کردیے۔ یہ تحریر اختلاف رائے کے حسن اظہار کا نمونہ ہے اور یہ وصف تو گویا مولانا اعظمی کی اس قسم کی ہر تحریر میں نمایاں ہے۔ امام زیلعی صاحب نصب الرایہ کی جلالت شان، علوئے مرتبت اور امامت فن کے بیان میں مولانا اعظمی نے لکھا کہ "ان خوبیوں کی سب سے زیادہ معتبر شہادت ان کی تخریج ہدایہ ہے، یہ ممکن نہیں کہ اس کو دیکھ کر کوئی انصاف پسند ان کی وسعت معلومات اور دقت نظر کا معترف نہ ہو جائے"۔

ان کا یہ قول خود اس مجموعہ مضامین کے لیے مستعار لیا جاسکتا ہے۔مولانا اعظمی کا درجہ حدیث وفقہ میں تو مسلم ہی ہے،علم عروض میں وہ کس پایہ کے تھے،اس کے لیے اس کتاب کا آخری مضمون بحر سریع اور بحر رمل کی ناقدانہ تشریح کے باب میں ہے۔مولانا سید سلیمان ندوی کی وفات پر مولانا اعظمی کے قطعہ تاریخ وفات پر کچھ سوالات قائم ہوئے،یہ مضمون ان ہی کا جواب ہے اور مولانا کے مطالعہ و تحقیق کی بلندی و وسعت کا شاہد بھی ہے،فاضل مرتب نے ذرا مبالغہ نہیں کیا جب یہ لکھا کہ اس کتاب کی سطر سطر علم و عرفان اور دانش و آگہی کا چھلکتا ہوا ساغر و پیمانہ ہے۔خصوصاً علوم اسلامیہ کے پیاسوں کے لیے تو سیرابی ہی سیرابی ہے۔

متن شناسی: از پروفیسر عبدالحق،متوسط تقطیع،بہترین کاغذ وطباعت،مجلد،صفحات ۲۰۴، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: زیر اہتمام،اقبال اکیڈمی (انڈیا) نئی دہلی،مصنف کا پتہ: ۲۳۱۵،ہڈسن لائن،کنگس ویز کیمپ،دہلی ۱۱۰۰۰۹۔

قدیم مخطوطات گویا کنز مکنون ہیں۔ان کی یافت ایک صاحب ذوق کے لیے بڑی سے بڑی مسرت اور قیمتی سے قیمتی ثروت کے مانند ہے۔لیکن اس سے پہلے یہ ادراک بھی اسی درجہ صحیح ہے کہ مخطوطات شناسی یا بالفاظ دیگر ان کی متن شناسی بھی کسی مہم جوئی سے کم نہیں۔متن کا مطالعہ،ترتیب، تدوین اور تقابل،کیسے کیسے صبر آزما مرحلے اس راہ میں آتے جاتے ہیں۔زیر نظر کتاب کے فاضل مصنف کو گرچہ درجہ امامت،اقبالیات کا حاصل ہے لیکن مخطوطات اور ان کو پانے اور محفوظ رکھنے کی صفت بھی ان کو ودیعت ہوئی۔اس کا ایک ثمرہ یہ بھی ہوا کہ بعض اہم مخطوطات ان کے مطالعہ و تحقیق سے خود بھی سرخرو ہوئے اور فاضل محقق کی بھی سرخ روئی کا سبب بن گئے۔شاہ حاتم اور دیوان زادہ ان کی عرق ریزی اور ژرف نگاہی کی بڑی دلیل ہے،اس سے پہلے کلیات ولی اور دیوان آبرو کے متنی مطالعہ نے اس فن کی آبرو میں اضافہ ہی کیا تھا،حالانکہ فاضل محقق کو ہمیشہ یہ احساس رہا کہ تدوین و ترتیب میں اگر کچھ ناکامی ہوئی تو آبرو لٹ جانے کا اندیشہ بھی باعث تشویش بن جاتا ہے اور یہ کہ عہد قدیم کی تحریروں کو پڑھنا اور پھر ان کی تصحیح جوئے شیر لانے سے بھی زیادہ آزمائشی ہے۔تجربات واحساسات کا یہی سرمایہ ہے جو اس نہایت قابل قدر کتاب میں پیش کر دیا گیا ہے کہ تحقیق،دقائق علم میں ہے،تحقیق کی شہ رگ متن ہے،متن درست نہیں تو تحقیق بھی مستند نہیں۔فاضل مصنف کی ہر کتاب کی طرح یہ کتاب بھی نافعیت کے ساتھ ادب عالی کی پاکیزہ ترین لذتوں سے ہم کنار کرتی ہے۔

سید محمد سبحان اللہ عظیم گورکھپوری کا سفر نامۂ حج: تقدیم و ترتیب جناب اصغر عباس، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۹۶، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ۔

قریب چھیانوے صفحات کی اس کتاب میں اصل سفر نامہ چھپن صفحات میں ہے اور ''میرا سفر حج'' کے عنوان سے ہے۔ چالیس صفحات میں فاضل مرتب نے مسافر حرم کے حالات فرض اور قرض سمجھ کر بڑی جامعیت کے ساتھ بیان کر دیے۔ فرض اس لیے کہ گورکھپور کی یہ نامور شخصیت اپنے گونا گوں اوصاف و خدمات اور مذہب و سیاست و ادب میں اپنے مقام بلند کی وجہ سے بجا طور پر یاد کیے جانے اور یاد رکھے جانے کی مستحق ہے، یہ ذمہ داری گورکھپور کے اہل قلم ہی کی نہیں، ہندوستان کی تاریخ پر نظر رکھنے والوں کی بھی تھی، شکر ہے کہ اس ادائے قرض و فرض کے لیے قرعہ فال فاضل مرتب کے نام نکلا اور انہوں نے یہ حق بحسن و خوبی اس کتاب کی شکل میں ادا کر دیا۔ سبحان اللہ مرحوم رئیس شہر تھے اور ایسے کہ ان کو پورب کا عبدالرحیم خان خاناں کہا گیا۔ مخطوطات اور کتابوں کے شائق تھے، اس شوق نے ایک بڑے کتب خانہ کی شکل اختیار کر لی جو بعد میں خدا بخش اور علی گڑھ کے کتب خانوں کی ثروت و حشمت کا سبب بن گیا۔ فاضل مرتب نے سفر نامہ حج کے بارے میں لکھا کہ ''یہ الگ پہچان رکھتا ہے، غالباً اسی لیے فاضل محققین اور ناقدین نے اسے نظر انداز کر دیا ہے''۔ یہ بالکل درست ہے کہ ۱۹۰۳ء کا یہ سفر حج، مشاہدات و واقعات کے لحاظ سے آج کسی دوسری دنیا کی تصویر نظر آتا ہے لیکن اس وجہ سے اس کو نظر انداز کیا جانا، قرین فہم نہیں، ۱۹۰۴ء میں یہ مختصر رسالہ کی شکل میں شائع ہوا اور بیس بائیس سال کے سبحان اللہ نے گورکھپور سے علی گڑھ اور وہاں سے بمبئی اور پھر جدہ تک جن دشواریوں کا سامنا کیا، وہ بے کم و کاست بیان کر دیا، وہ زمانہ ''شریف مکہ'' کا تھا اور بدامنی اور بدانتظامی کی وجہ سے پورا خطہ حجاز درد و کرب کے عالم میں تھا۔ مذہبی، تعلیمی اور انتظامی افراتفری کا اثر ظاہر ہے حاجیوں پر پڑنا ہی تھا، ایسے میں نوجوان سبحان اللہ کے قلبی تاثرات کی جگہ غم اور افسوس کے جذبات نے لی، صحیح کہا گیا کہ پر جوش زائر سے زیادہ وہ پرجوش مصلح بن گئے۔ ان پر کیا گزری اس کا اندازہ صرف اس جملہ سے کیا جا سکتا ہے ''ٹھنڈے دل سے کہتا ہوں مگر کہنے میں دل میں گرمی محسوس ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی باہمی نفرت، بہت نفرت کے قابل ہے''۔ پورا سفر نامہ آج حیران کن لگتا ہے مگر ایک صدی کے انقلاب کی رفتار کا مشاہدہ بہر حال کرا دیتا ہے، یہ دلچسپ ہے، عجیب ہے، حیرت افزا ہے اور عبرت انگیز بھی۔ اس لیے بار بار پڑھنے کے لائق ہے۔

ع۔ص

رسید کتب موصولہ

اردو کی تحریکی شاعری (جنگ آزادی سے حصول آزادی تک): از ڈاکٹر مظفر مہدی، تاج بک ڈپو، رانچی، ناولٹی بکس، قلعہ گھاٹ، دربھنگہ۔ قیمت=/۲۳۹ روپے

تکمیلے: از علیم صبا نویدی، مرتب ڈاکٹر جاوید حبیب، تری پلی کین ہائی روڈ، رائس منڈی اسٹریٹ، چنئی۔ قیمت=/۳۰۰ روپے

خوش فکر شاعر، شرف الدین ساحل: مرتب محمد رفیع الدین، ساحل کمپیوٹر، حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگپور (مہاراشٹر)۔ قیمت=/۱۰۰ روپے

دوہاٹے: نثار جیراج پوری، ۶۷-جالندھری، اعظم گڑھ۔ قیمت=/۳۵۰ روپے

صدائے ناقوسیان (لکھنؤ کے اردو گو ہندو شعراء کا تذکرہ): احمد نوید یاسر ازلان حیدر، دبیر حسن میموریل لائبریری ۱۲، چودھری محلہ، کاکوری، لکھنؤ۔ قیمت=/۲۰۰ روپے

عربی زبان وادب وفقہ کی تعلیم اور عصری تقاضے: نواب عالم ندوی، صفہ اکیڈمی، اجمیر، جامعہ معین الدین چشتی، سول پور روڈ، چندوالا، پوسٹ ایچ ایم ٹی اجمیر (راجستھان)۔ قیمت=/۲۰۰ روپے

قرآن مجید میں نظم وترتیب (ایک تجزیاتی مطالعہ): ڈاکٹر محمد راشد ایوب اصلاحی، البلاغ پبلی کیشنز، N-1، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵۔ قیمت=/۱۰۰ روپے

مضامین بسمل: بسمل اعظمی (محمد ایوب)، ۳۰۵-ڈی، پرکاش کمپلیکس، سنتوش نگر، ممبرا، تھانہ۔ قیمت=/۱۵۰ روپے

معارف شبلی (علامہ شبلی کی تاریخ نویسی پر معارف، اعظم گڑھ میں شائع ہونے والے مضامین): ترتیب و تقدیم ڈاکٹر محمد سہیل شفیق، فلیٹ نمبر A-15، گلشن امین ٹاور، گلستان جوہر، بلاک ۱۵، کراچی۔ قیمت=/۳۴۰ روپے

یادگار عزیز اندوری: پروفیسر حدیث انصاری، البلاغ پبلی کیشنز، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵۔ قیمت=/۱۷۳ روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-	موازنہ انیس و دبیر	100/-
سیرۃ النبیؐ		اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر	100/-
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2200/-	سفرنامہ روم و مصر و شام	200/-
علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی		کلیات شبلی (اردو)	180/-
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-	کلیات شبلی (فارسی)	45/-
الفاروق	300/-	مقالات شبلی اول (مذہبی)	100/-
الغزالی	200/-	مرتبہ: سید سلیمان ندوی	
المامون	175/-	مقالات شبلی دوم (ادبی) 〃	70/-
سیرۃ النعمان	300/-	مقالات شبلی سوم (تعلیمی) 〃	80/-
سوانح مولانا روم	80/-	مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) 〃	200/-
شعر العجم اول	150/-	مقالات شبلی پنجم (سوانحی) 〃	150/-
شعر العجم دوم	130/-	مقالات شبلی ششم (تاریخی) 〃	90/-
شعر العجم سوم	125/-	مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) 〃	100/-
شعر العجم چہارم	150/-	مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری) 〃	110/-
شعر العجم پنجم	120/-	خطبات شبلی مرتبہ: عبدالسلام ندوی	80/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-	انتخابات شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی		مکاتیب شبلی اول 〃	150/-
الکلام	230/-	مکاتیب شبلی دوم 〃	190/-
علم الکلام	180/-	شذرات شبلی مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print
March 2017 Vol - 199 (3)
RNI. 13667/57 **MA'ARIF** AZM/NP- 43/019
Monthly Journal of
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

تصانیف و مطبوعات شبلی صدی تقریبات

۱۔	سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	علامہ شبلی نعمانی	2000/-
۲۔	شبلی کی آپ بیتی	ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
۳۔	دار المصنّفین کے سو سال	کلیم صفات اصلاحی	350/-
۴۔	شذرات شبلی (الندوہ کے شذرات)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-
۵۔	الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	علامہ شبلی نعمانی تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-
۶۔	محمد شبلی لائف اینڈ کنٹری بیوشنس	ڈاکٹر جاوید علی خاں	230/-
۷۔	حیات شبلی (جدید)	علامہ سید سلیمان ندوی	650/-
۸۔	مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	اشتیاق احمد ظلی	250/-
۹۔	حیات سعدی	تصنیف: خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
۱۰۔	شبلی شناسی کے اولین نقوش	مرتبہ: ظفر احمد صدیقی	600/-
۱۱۔	شبلی ایک دبستان	آفتاب احمد صدیقی	250/-
۱۲۔	متاع رفتگاں	شاہ معین الدین احمد ندوی	200/-
۱۳۔	یہود اور قرآن مجید	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	150/-
۱۴۔	رسائل شبلی	علامہ شبلی نعمانی	300/-
۱۵۔	اردو ترجمہ مکاتیب شبلی	ڈاکٹر خالد ندیم	110/-
۱۶۔	تاریخ بدء الاسلام (علامہ شبلی نعمانی)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	300/-
۱۷۔	مراسلات شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	150/-